URDU اُردو

(گیارھویں جماعت کے لئے)

STANDARD - XI
READER AND SUPLEMENTARY READER

چھوت چھات ایک غیر انسانی فعل ہے
ایک گناہ ہے
ایک عظیم جرم ہے

ٹمل ناڈو ٹکسٹ بک کارپوریشن

کالج روڈ، مدراس ۔ 600 006

TAMILNADU TEXTBOOK CORPORATION
College Road, Chennai - 600 006

© GOVERNMENT OF TAMIL NADU

First Edition 2004

Reprint - 2005

CHAIRPERSON

DR. SYED SAJJAD HUSSAIN
Professor of Urdu
University of Madras

AUTHORS

SYED MD. ISMAIL
Vice - Principal
Govt. Muslim Teachers Training Institute
Chennai - 600 002

DR. K. HABEEB AHMED
Lecturer in Urdu
University of Madras
Chennai - 600 005.

DR. YASMEEN AHMED
Head, Dept of Urdu
Presidency College
Chennai - 600 005.

V. MD. BASHA
P. G. Teacher (Urdu)
Govt. Muslim Hr. Sec. School
Vellore.

REVIEWERS

DR. PARVEEN FATHIMA
Head, Dept. of Urdu
Queen Mary's College
Chennai - 600 004.

SHAIK ZAINUL ABIDEEN
P. G. Teacher (Urdu)
Muslim Higher Sec School
Chennai - 600 005.

Price . Rs. 22.00

This book has been prepared by the Directorate of School Education on behalf of the Govt. of Tamilnadu.

This book has been printed on 60 G.S.M Paper

Printed by Web Offset at :
Bhagat Printers, Chennai - 600 117.

قومی ترانہ

جن گن، من ادھنا یک جئے ہے
بھارت بھاگیہ وِدھا تا
پنجاب ، سندھ ، گجرات ، مراٹھا
دراوڑ ، اتکل ، ونگا
وندھیہ ، ہماچل ، یَمنا ، گنگا
اُچ چھل جَل دھی ترنگا
تو اشبھ ، نامے جاگے
تو اشبھ ، آشش مانگے
گا ہے توا جئے گا تھا
جن گن منگل دایک جئے ہے
بھارت بھاگیہ وِدھا تا
جے ہے جے ہے جے ہے
جئے، جئے، جئے، جئے، ہے.

جذباتی یکجہتی کا اقرار

ہندوستان میرا وطن ہے، سارے ہندوستانی میرے بھائی بہن ہیں۔ مجھے اپنے وطن سے محبت ہے۔ اور میں اس کے بھرپور اور گوناگوں ورثے پر نازاں ہوں۔ میں ہمیشہ اس کا اہل بننے میں کوشاں رہوں گا۔ میں اپنے ماں باپ، اساتذہ اور بزرگوں کا احترام کروں گا اور ہر ایک سے اخلاق کے ساتھ پیش آؤں گا۔ میں اپنے وطن اور اس کے باشندوں کیلئے جاں نثاری کا اقرار کرتا ہوں۔ انہیں کی خوش حالی اور فراغت میں میری مسرت پوشیدہ ہے۔

تمل زبان کی عظمت

حسینہ زمین، پُر جوش سمندر کو اوڑھے ہوئے ہے۔ خطّہ بھارت اس حسینہ کا دمکتا ہوا چہرہ ہے۔ علاقہ دکن اس چہرے کی پُر وقار ہلال نما پیشانی ہے۔ جس پر دراوڑ کا مہکتا ہوا تلک لگا ہوا ہے۔

اے قابل فخر دوشیزۂ تمل! اے دوشیزۂ تمل

تو ہی اس تلک کی خوشبو ہے جس سے سارا جہاں لطف اندوز ہو رہا ہے۔ دنیا کا چپّہ چپّہ تیری مہکتی خوبیوں سے معطّر ہو رہا ہے!

ہم تیری پُرشکوہ، سدا بہار جوانی کے جوہر پہ حیراں بے خودی کے عالم میں تیری عظمت کے گیت گاتے ہیں۔

اے دوشیزۂ تمل زندہ باد! پائندہ باد!

مترجم: سجّاد بخاری

پے۔ سُندم پلّے ''منون منیم''

پیش لفظ

تعلیم شائستہ اور مہذب زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے تعلیم کو صوبائی سطح پر رواج دینا اور اسے بہتر خطوط فکر پر قائم کرنا حکومت کا دائرہ کار ہے۔ تعلیم پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت سبھی بلا تفریق مذہب و ملت تعلیم پا سکتے ہیں۔ حکومت ٹمل ناڈو اسی مقصد کے تحت بڑی فیاضی کے ساتھ صوبائی سطح پر تعلیم وتدریس کا وسیع تر جال بچھانے اور اس کو موثر بنانے کے اقدامات کر رہی ہے۔ کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ صوبہ کی مجموعی ترقی کا انحصار صوبہ کے تعلیم یافتہ عوام کے تناسب پر ہے۔ یہ تناسب جتنا بڑھے گا صوبہ اسی قدر سماجی تہذیبی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے بہتر طور پر اپنی شناخت قائم کر سکے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کو موثر بنانے میں اس کا نصاب ایک کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ حکومت ٹمل ناڈو نے اس بابت تعلیمی سال 2003-2004 سے نئے نصاب کی تشکیل اور کتابوں کو ترتیب دینے کا فیصلہ کیا ہے یہ فیصلہ حکومت کی فراخ دلی کا ضامن ہی نہیں بلکہ اس کے سیکولر کردار کی روشن دلیل بھی ہے جہاں دوسرے اسباق کے لئے نئی نصابی کمیٹیاں اور کتابوں کی ترتیب کے لئے نئے بورڈ تشکیل دیئے گئے وہاں اردو کے لئے بھی نئی نصابی کمیٹی اور کتاب کی ترتیب کے لئے

نئے بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ نصاب کی تیاری اور کتاب کی ترتیب کے دوران اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ طلبا و طالبات کے اندر جدید تقاضوں کے ساتھ زندگی کی روزمرہ ضروریات کو سمجھنے اور پرکھنے کا بہتر شعور پیدا ہو سکے۔ اس ضمن میں اس بات کا خیال بھی رکھا گیا کہ ایک طرف طلباء و طالبات میں گیارہویں جماعت ہی سے معروضی مطالعے کا ادراک پیدا ہو تو دوسری طرف وہ بولنے اور لکھنے پر بھی قدرت حاصل کر سکیں۔ اس کے لئے ہم نے کتاب میں مشق اور عملی کام کے ساتھ ساتھ معلوماتی اور دلچسپ مضامین کو داخل نصاب کیا ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ میں پرمغز اور معلوماتی مضامین اور دلچسپ نظمیں شامل ہیں۔ جب کہ کتاب کا دوسرا حصہ سات سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ معزز مرتبین کتاب کے بھرپور تعاون اور محنت شاقہ کے نتیجہ میں یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ ٹکسٹ بک کارپوریشن اور سررشتہ تعلیمات دونوں اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اُن تمام ادیبوں اور شاعروں کا بھی جن کی تخلیقات سے یہ کتاب مزّین ہوئی ہے۔

چیرپرسن

(کمیٹی برائے نصابِ اردو)

فہرست مضامین

حصہ نظم

1 -	حمد		1
2 -	نعت		5
3 -	مسدس		9
4 -	مثنوی		15
5 -	مرثیہ		22
6 -	شہرآشوب		30
7 -	شکوہ	نظم	34
8 -	آدمی نامہ	نظم	39
9 -	وطن	نظم	44
10 -	جمہور کا اعلان نامہ	نظم	48

11	-	قطعات		52
12	-	غزل	ولی	57
13	-	غزل	درد	61
14	-	غزل	ذوق	64
15	-	غزل	غالب	67
16	-	غزل	مومن	70
17		غزل	جگر مرادآبادی	72
18	-	غزل	حسرت موہانی	74
19	-	غزل	جاں نثار اختر	77
20	-	غزل	عظمت اللہ سرمدی	80
21	-	غزل	بدر جمالی	83
22	-	غزل	حامد الانصاری	86
23	-	غزل	کاظم نائطی	89
24	-	غزل	کاوش بدری	92
25	-	غزل	علیم صبا نویدی	95
26	-	غزل	حسن فیاض	98
27		غزل	جلال مدنی	100
28	-	غزل	حسرت سہروردی	102

حصہ نثر

1 - تعصب 105

2 - زبان گویا 114

3 - نور جہاں 120

4 - دستگیری 128

5 - روپیہ عالم سکرات میں 140

6 - سوتیلی ماں کا آخری وقت 152

7 - انٹرنیٹ 162

8 - خوابوں کی رہنمائی میں 169

9 - مہاتما گاندھی کی اَن مٹ یادیں 178

10 - مسکراہٹ بھی اثر رکھتی ہے 193

11 - قواعد 202

اردو نان ڈیٹیل

1	پنچ پرمیشور -	214
2	بھیک -	231
3	پانچ اشرفیاں -	242
4	نادان ٹیچر -	250
5	بند کتاب -	258
6	اختر کی پنسل -	271
7	حاجی مراد -	277

طلباء وطالبات کے لئے ضروری ہدایات

حکومت ٹمل ناڈو کی سفارشات پر سر رشتۂ تعلیمات نے تعلیمی سال 2003-2004 سے گیارویں جماعت کیلئے اردو کی نصابی کتاب ازسر نو تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس کتاب میں طلباء وطالبات کی عام دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید موضوعات پر مشتمل مضامین کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ سائنس، اخلاق، سماجیات اور جدید ٹکنولوجی سے تعلق رکھنے والے مضامین کی شمولیت کا مقصد نہ صرف طالب علم کے اندر حصول علم کا جذبہ ابھارنا ہے، بلکہ روزمرہ زندگی میں ان کی ضرورت واہمیت سے بہرور کرنا بھی ہے۔

منظومات اور نثر کے مضامین کے اختتام پر طلباء وطالبات کیلئے جو عملی مشق دے گئے ہیں ان سے معروضی انداز نظر کے ساتھ تنقیدی شعور پیدا کرنا مقصود ہے۔ عموماً اردو پڑھنے والے طلباء وطالبات مسابقتی امتحانات میں عدم اعتماد کے سبب بیشتر ناکام ہوجاتے ہیں اس لئے ان کے اندر اعتماد ویقین پیدا کرنے کیلئے عملی کام کے نئے طرز اور طریقہ کار کو اپنایا گیا ہے۔

منظومات کا حصہ بھی جاذبِ نظر ہے اور جو طلباء وطالبات کو دعوت فکر ونظر

دیتا ہے۔ طلباء وطالبات کو چاہیئے کہ وہ اپنے مطالعہ کے دوران حصہ نظم ونثر کے تحت جتنے مضامین اور نظمیں ہیں ان کا اپنے استاد کی نگرانی میں مطالعہ کریں۔

مطالعہ کیلئے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ ہر طالب علم اس کتاب کے ایک ایک مضمون کو پڑھے۔ پھر بآواز بلند اس کی قرأت کرے۔ استاد کی نگرانی میں اپنے تلفظ کی ادائیگی کو درست کرے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھے تاکہ الفاظ سننے والوں کو بہ آسانی سمجھ میں آسکیں اس طرح طالب علم اپنی قوت گویائی کو جلا بخش سکتا ہے۔ مطالعہ کے دوران دوسری اہم بات یہ ہے کہ نظم یا مضمون کو پڑھنے کے بعد اس کے مرکزی خیال کی طرف طالب علم اپنی توجہ مبذول کرے۔ مضمون یا نظم کو اس کے پس منظر میں سمجھے اگر مضمون یا نظم کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے۔ تو استاد سے اس کی وضاحت چاہے۔ استاد کی رہنمائی میں ہی آپ نظم یا مضمون کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

مفہوم سمجھنے کے بعد آپ مضمون نگار یا نظم نگار کے بارے میں استاد سے معلومات حاصل کریں تاکہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ اردو ادب میں اس کا کیا مقام ہے اور وہ کس صنفِ ادب کیلئے زیادہ مشہور رہے۔ طالب علم کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نظم یا مضمون کو ذہن نشیں کرے ورنہ نظم یا مضمون تو آپ پڑھ لیں گے مگر اس کا مفہوم اور موضوع آپ کے ذہن میں محفوظ نہیں رہے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ مضمون کا خلاصہ اپنی کاپی میں لکھیں اور استاد کو دکھائیں۔ اس طرح آپ ایک طرف لکھنے کی مشق کرتے ہیں تو دوسری طرف نظم یا مضمون کے

مفہوم سے خاطر خواہ واقفیت بھی پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

نصابی کتاب میں عملی کام دراصل طالب علم کی ذہانت کا امتحان ہوتا ہے۔ اس لیئے اسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ عملی کام میں بعض اہم نکات پیش کیئے جاتے ہیں۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ دی جاتی ہے۔ مختصر اور تفصیلی سوالات ہوتے ہیں جو بجائے خود طالب علم کے اندر چھپے جوہر کو ابھارتے ہیں۔ خانہ پُری، جوڑ لگاؤ، صحیح جواب کا انتخاب اور اسی قبیل کے اور بھی عملی کام طالب علم کے ذوق مطالعہ کو نہ صرف بڑھاتے ہیں بلکہ ایک طرح سے اس کے ذہن کی آبیاری بھی کرتے ہیں۔

استاد، طالب علم کیلئے ایک علمی اثاثہ ہے۔ طالب علم کو چاہیئے کہ وہ درس و تدریس کے دوران کسی بھی علمی مسئلہ کو جو اس کی سمجھ میں نہ آئے استاد سے رجوع کرے۔ مسئلہ کا حل دریافت کرے اور پھر آگے قدم بڑھائے۔ جب تک کوئی بات اچھی طرح سمجھ میں نہ آجائے، طالب علم کو آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ مفہوم سمجھے بغیر صرف نظم یا مضمون کو رَٹ لینا ایک اچھے طالب علم کی نشانی نہیں ہے۔ رٹنا تو صرف طوطے کا کام ہے۔ طالب علموں کا نہیں۔ طالب علم تو سمجھ کر، دل لگا کر کتاب کو پڑھتا ہے۔ اس کے اندر موجود مفہوم و مطالب کی تہہ تک پہنچ کر اس سے اپنے دل و دماغ کو روشن کرتا ہے۔ اس طرح طالب علم ان ہدایات کی روشنی میں اپنی بہتر شناخت قائم کرسکتا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ

ابوالبیان حمّاد

مولانا عبدالرحمٰن مالوری عمری المتخلص بہ ابوالبیان حمّاد جولائی 1923ء میں بمقام کولار (کرناٹک) پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ دارالسلام عمر آباد میں 1936ء میں داخلہ لیا۔ اور یہیں سے مولوی فاضل کی سند حاصل کی۔ آپ پر علامہ شاکر نائطی کی شخصیت کا گہرا اثر رہا ہے۔ عربی فارسی سے دلچسپی مولانا شاکر ہی کی دین ہے۔ شاعری میں آپ نے حضرت ماہر القادری سے رشتہ تلمذ اختیار کیا۔ اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ حضرت حمّاد کی شاعری میں اسلامی موضوعات جگہ پانے لگے۔ 1946ء سے جامعہ دارالسلام میں بحیثیت مدرّس خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ جامعہ سے نکلنے والے ماہنامہ رسالہ ''راہ اعتدال'' کے مدیر بھی رہے ہیں۔ آپ کی جو تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہوکر مقبول ہوئیں ان میں ''توحید کی حقیقت'' ''تازیانے'' ''بھارت کی تاریخ کا ایک گم شدہ ورق'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہے میرے دل کی لگن لا الہ الا اللہ — میرے جگر کی جلن لا الہ الا اللہ

فروغ حسن چمن لا الہ الا اللہ — بہار سرو سمن لا الہ الا اللہ

یہ وہ بہار ہے جس میں نہیں خزاں کا گذر — کھلا ہوا ہے چمن لا الہ الا اللہ

خدا کی یاد سے دل کو سکون ملتا ہے — دوائے رنج و محن لا الہ الا اللہ

ہر ایک ملک میں گونجا ہے نغمۂ توحید — عراق ہو کہ یمن لا الہ الا اللہ

درِ بہشتِ بریں جلد جس سے کھل جائے — کلید باغ عدن لا الہ الا اللہ

یہ شانِ مردِ مجاہد یہ اُسکا رعب وجلال — بندھا ہے سر پہ کفن لا الہ الا اللہ

نہیں قیودِ زماں و مکاں کا یہ پابند — ہے بے نیاز وطن لا الہ الا اللہ

مری نگاہ میں جچتی نہیں کوئی دولت — ہے میرا ایک ہی دھن لا الہ الا اللہ

یہ ہے بھی تازہ بہ تازہ یہ نو بہ نو بھی ہے — کبھی نہ ہوگا کُہن لا الہ الا اللہ

کہاں نہیں ہیں شگفتہ تجلیات کے پھول — وہ دشت ہو کہ چمن لا الہ الا اللہ

جہانِ دل سے خیال حبیب سے آباد — رہوں میں یوں ہی مگن لا الہ الا اللہ

تھے لا الہ کی شرح جمیل وہ دونوں — حُسین اور حَسن لا الہ الا اللہ

الٰہی راز خودی کو میں آشکار کروں — ہو روح شعر وسخن لا الہ الا اللہ

خدا کے فضل وکرم ہی کا فیض ہے حمّادؔ
یہ میرا فکر یہ فن لا الہ الا اللہ

حمد: وہ نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جاتی ہے۔اس کی نعمتوں اور احسانات کا ذکر کیا جاتا ہے، اسے ''حمد'' کہتے ہیں۔

سوالات:

I۔ (الف)

1) وہ کونسی بہار ہے جس میں خزاں کا گزر نہیں؟

2) خدا کی یاد سے دل کو کیا حاصل ہوتا ہے؟

3) جنت کا دروازہ کھلنے کی چابی شاعر نے کس کلمہ کو قرار دیا ہے؟

4) مردِ مجاہد کی شان کا اظہار شاعر نے کن الفاظ میں کیا ہے؟

5) شاعر کی نگاہ میں کونسی دولت جچتی ہے؟

6) شگفتہ تجلیات کے پھول شاعر کی نگاہ میں کہاں کہاں کھلتے ہیں؟

7) شاعر کا دل کس چیز سے آباد ہے؟

8) حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو شاعر نے کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

9) خدا کے فضل وکرم کا فیض شاعر کس چیز کو بتاتا ہے؟

(ب) حمادؔ نے اپنی نظم ''حمد'' میں خدا کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے تفصیل سے لکھیے۔

II۔ ''لا الہ الا اللہ'' کلمۂ توحید ہے اسلام کے پہلے کلمہ کا ایک حصّہ ہے۔ اس نظم کا عنوان ''لا الہ الا اللہ'' ہے اس میں شاعر اپنے پیدا کرنے والے مالک کی تعریف کرتا ہے۔ ایک ہونے کا اقرار کرتا ہے کہ ''نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق سوائے اللہ کے'' اللہ کی عبادت کرنا، اس کی توحید کو ماننا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس کی نعمتوں کو یاد کرنا اور اس کا شکر کرنا چاہیے۔

III۔ اس نظم میں شاعر حمآد نے کلمۂ لا الہ الا اللہ کو اپنے دل کی لگن، جگر کی جلن، فروغ حسنِ چمن، پھولوں کی بہار کا چمن قرار دیا ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ شاعر نے اللہ تعالی کی تعریف بھی کی ہے اور اس کلمہ کی اہمیت کو بھی بتلایا ہے۔ اس کا ہر شعر دل کو چھو لیتا ہے۔

اس نظم کو ایک بار غور سے پڑھیے اور سمجھیے۔

نعت

مختاؔر بدری

مختاؔر بدری 1939ء میں کے۔ جی۔ ایف۔ میں پیدا ہوئے۔ اسکول کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ کرشنا گری کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ بمبئی میں کافی عرصہ رہے۔ خواجہ احمد عباس سے طبعی مناسبت بھی تھی اور قربت بھی حاصل رہی۔ خواجہ احمد عباس کے علاوہ کرشن چندر، رام لال وغیرہ کے اردو افسانوں کا تمل زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ''ترو کرل'' کا اردو میں منظوم ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ''اسلام - الف سے ے تک'' اور ''اسلامی نام'' ان کی دیگر قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ آپ کہنہ مشق شاعر بھی ہیں۔

ابرِ سخا بدرالدجیٰ نورُالھُدیٰ خیرالوریٰ صلی علیٰ صلی علیٰ
حضرت محمد مصطفےٰ وہ محترم بعد از خدا صلی علیٰ صلی علیٰ

وہ منبعِ جُود و سخا وہ مبدۂ فیض و عطا وہ معدنِ صدق و صفا
وہ سب سے عالی مرتبہ وہم و گماں سے ماورا صلی علیٰ صلی علیٰ

وہ پیشوائے اصفیا　وہ صاحب قبلہ نما　وہ غم گسار بے نوا
وہ کعبۂ اہل وفا　وہ مظہر ذات خدا　صلی علیٰ صلی علیٰ

وہ شمع ایمان ویقیں　وہ رہبر دنیا و دیں　وہ صاحب فتح مبیں
وہ مقتدائے انبیاء　وہ مرجع شاہ و گدا　صلی علیٰ صلی علیٰ

وہ عظمت لوح وقلم　شاہ امم بحر کرم　بے شبہ سب سے محترم
کونین میں کہیو بھلا　کیا ہے محمدؐ کے سوا　صلی علیٰ صلی علیٰ

وہ مرکز وجدان ہیں　وہ صاحب قرآن ہیں　حق کی وہی پہچان ہیں
گونجی ہے ان سے ہر جگہ　اللہ اکبر کی صدا　صلی علیٰ صلی علیٰ

گہوارۂ علم وادب　ٹھہرے مگرامی لقب　ان کے سبب عرفان رب
لکھا بخطِ نور کیا　در باب عرش کبریا　صلی علیٰ صلی علیٰ

یثرب کی پاکیزہ زمیں　آرام فرما ہیں یہیں　حضرت امام المرسلیں
یثرب میں جو ٹھہرا رہا　اس کے مقدر پر فدا　صلی علیٰ صلی علیٰ

ہر بات پر سرکارؐ کی　مہر خداوندی لگی　کیا بات ہے اس سے بڑی
جو ہے رضائے مصطفےٰ　ہاں ہاں وہی رب کی رضا　صلی علیٰ صلی علیٰ

تم عظمت حرمیں کہو　یا سرورِ کونین کہو　یا رحمت دارین کہو

اونچا ہے ان کا مرتبہ　بھیجے درود اُن پر خدا　صلی علیٰ صلی علیٰ

مجھ پر درِ رحمت کھلا　عشقِ محمد کا صلہ　مختار مجھ کو مل گیا

ان کا بلاوا آ گیا　میں چل پڑا کہتا ہوا　صلی علیٰ صلی علیٰ

نعت: وہ نظم جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی جائے اسے نعت کہتے ہیں۔

سوالات:

I۔ (الف)

1) خدا کے بعد شاعر نے کسے محترم قرار دیا ہے؟

2) حضرت محمدؐ کے عالی مرتبہ کی شاعر نے کن الفاظ میں تعریف کی ہے؟

3) حضرت محمدؐ کس کے پیشوا اور غم گسار ہیں؟

4) آپؐ سے ہر جگہ کونسی صدا گونجی ہے؟

5) شاعر نے حضرت محمدؐ کے علم و عرفان کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے؟

6) شاعر نے ''رضائے مصطفٰی'' کو کس کی رضا قرار دی ہے؟

7) شاعر پر در رحمت کے کھلنے سے کیا ہوا؟

(ب) اس نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے :

II اس نظم میں صلی علیٰ کے معنے ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی رحمت ہو۔ شاعر نے اس نظم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف مختلف انداز سے کی ہے۔ اس نظم کے پہلے بند میں شاعر مختارؔ نے آپؐ کو ''ابر سخا'' سخاوت کا بادل، بدر الدجیٰ ''روشن چاند جیسے خطابات سے یاد کیا ہے اور آپؐ کی توصیف بیان کی ہے اس طرح کے خطاب اس نظم میں جہاں کہیں آئے ہیں ان پر غور کیجیے۔

مسدس حالی

خواجہ الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین نام اور حالؔی تخلص تھا۔ پانی پت میں 1837ء میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا۔ جوانی میں دہلی آئے جہاں غالب اور شیفتہ کی صحبت سے استفادہ کیا۔ شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ لاہور میں نئی نظم کی تحریک سے وابستہ رہے وہ سرسید تحریک کے سب سے اہم اراکین میں تھے۔

حالؔی انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ان کی طبیعت پر مغربی خیالات کا بہت اثر ہوا۔ نئے نئے عنوانات پر نظمیں لکھیں، جن میں سادگی روانی اور اثر ہے ان کی طویل نظم ''مدو جزر اسلام'' جو ''مسدس حالی'' کے نام سے مشہور ہے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ حالی نے اپنے دیوان کا طویل مقدمہ لکھا جو ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کے نام سے علاحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کتاب سے اردو میں باضابطہ تنقید نگاری کا آغاز ہوا۔

حالی اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تصانیف میں ''حیاتِ جاوید'' ''یادگار غالب'' اور مقالات حالی مشہور ہیں۔ 1914ء میں حالی کا انتقال ہوا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے در گزر کرنے والا　　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا　　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　　پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رُخ ہوا کا
وہ فخر عرب زیب محراب و منبر　　　تمام اہل مکہ کو ہمراہ لیکر
گیا ایک دن حسب فرمانِ داور　　　سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ اے آل غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب''
کہا سب نے ''آجتک کوئی تیرا　　　کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا''
کہا ''گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا　　　تو باور کروگے اگر میں کہونگا''

کہ فوجِ گراں پشت کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پا کر''

کہا ''تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے''

کہا ''گر میری بات یہ دلنشیں ہے
تو سن لو خلاف اسمیں اصلاً نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانیوالا''
ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنیوالا''

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا
حقیقت کا گر ان کا ایک اک بتایا

زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا
بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیئے ایک پردہ اٹھا کر

کسی کو ازل کا نہ تھا یاد پیماں
بھلائے تھے بندوں نے مالک کے فرماں

زمانہ میں تھا دور صہبائے بطلاں
مئے حق سے محرم نہ تھی بزم دوراں

اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک
خم معرفت کا تھا منہ خام اب تک

نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا سے
نہ آگاہ تھے مبدا و منتہا سے

لگائی تھی ایک اک نے لو ماسوا سے
پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا

یہ راعی نے للکار کر جب پکارا

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لایق　　زبان اور دل کی شہادت کے لایق

اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لایق　　اسی کی ہے سرکار خدمت کے لایق

لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ

جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

مسدس: اُردو شاعری کی ایک نہایت مقبول اور مشہور صنف ہے۔اس کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مسدس میں کئی بند ہوتے ہیں۔ ہر بند کے چار مصرعے ایک قافیہ میں ہوتے ہیں،اس کے بعد کے دو مصرعے دوسرے قافیہ میں لکھ کران کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

اُردو میں خواجہ الطاف حسین حاؔلی کی مسدس مشہور ہے۔ اقباؔل کی نظمیں اور انیسؔ و دبیر کے تمام مرثیے مسدّس کی شکل میں ہیں۔

سوالات :

I۔ (الف):

1) مسدس کس طرح کی نظم کو کہتے ہیں؟

2) نظم کے پہلے بند میں شاعر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے؟

3) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی تعریف شاعر نے کن الفاظ کی ہے؟

4) جاہل عربوں کی کایا حضرت محمدؐ نے کس طرح پلٹ دی؟

5) ایک دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکّہ سے کیا کہا؟

6) قوم نے آپ کا کیا جواب دیا؟

7) قوم کا جواب سن کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟

8) اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی؟

9) آپؐ نے عرب کا نقشہ کس طرح بدل ڈالا؟

(ب) شاعر نے اس نظم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے۔

II- اس نظم میں شاعر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی ہے اور

آپ کو کئی القاب سے یاد کیا ہے مثلاً

۱) نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

۲) غریبوں کی مرادوں کو پورا کرنے والا

۳) فقیروں کا ملجا یعنی فقیروں کی پناہ لینے کی جگہ

۴) ضعیفوں کا ماوی یعنی کمزوروں کا مکاں ان کے لوٹ آنے کی جگہ

اس طرح قوم نے آپ کو ''امین'' یعنی امانت دار ''صادق'' یعنی سچّا کہا ہے اس سے آپؐ کے اعلیٰ اوصاف اور بلند اخلاق کا اظہار ہوتا ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر ایک مضمون لکھیے۔

شہنشاہ گیتی پناہ

(مثنوی)

میر حسنؔ

میر غلام حسن نام، حسنؔ تخلص دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب آصف الدولہ نے لکھنؤ آباد کیا تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ شاعری ان کے خاندان میں بزرگوں کے وقت سے چلی آ رہی تھی۔ ان کے والد میر ضاحکؔ بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ ابتدا میں انہیں سے اصلاح لی بعد میں میر حسنؔ اپنا کلام میر درد کو دکھانے لگے۔

میر حسن کے یہاں محاورے کا لطف اور زبان و بیان میں حد درجہ سلامت و روانی توجہ کے قابل ہے۔ ان کی شہرت کا باعث ان کا کارنامہ ''مثنوی سحرالبیان'' ہے۔ جس کے انداز بیان اور طرز ادا کا لطف اتنا عمدہ ہے کہ ڈیڑھ سو برس گذرنے پر بھی کم نہیں ہوا۔ یہ مثنوی اس قدر دلچسپ اور مقبول عام ہے کہ اس کے اکثر اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں۔

میر حسنؔ کا انتقال 1786ء میں ہوا۔ مصحفیؔ نے ''شاعر شیریں بیاں'' سے مادہ وفات نکالا۔

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہ گیتی پناہ

بہت حشمت و جاہ مال ومنال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال

کئی بادشاہ اُس کو دیتے تھے باج
خطا اور خُتن سے وہ لیتا خراج

کوئی دیکھتا آ کے جب اُس کی فوج
تو کہتا ہے کہ بحر ہستی کی موج

رعیّت تھی آسودہ و بے خطر
نہ غم مُفلسی کا، نہ چوری کا ڈر

عجب شہر تھا اُس کا مینو سواد
کہ قدرت خُدائی کی آتی تھی یاد

کہوں قلعے کی اُس کے کیا میں شکوہ
گئے دب بلندی کو دیکھ اُس کی، کوہ

وہ دولت سرا، خانۂ نور تھا
سدا عیش و عشرت سے معمور تھا

ہمیشہ خوشی، رات دن سیر باغ
نہ دیکھا کسی دل پہ جُز لالہ داغ

سدا عیش و عشرت، سدا راگ ورنگ
نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بہ تنگ

غنی وھاں ہوا جو کہ آیا تباہ
عجب شہر تھا وہ، عجب بادشاہ

نہ دیکھا کسی نے کوئی وھاں فقیر
ہوئے اُس کی دولت سے گھر گھر امیر

ہزاروں پری پیکر اُس کے غلام
کمر بستہ خدمت میں حاضر مُدام

کسی طرف سے وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا الم

اسی بات کا اُس کے تھا دل پہ داغ
نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

وزیروں کو ایک روز اُس نے بلا
جو کچھ دل کا احوال تھا، سو کہا

کہ میں کیا کروں گا یہ مال ومنال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج
نہ پیدا ہوا وارث تخت و تاج

جوانی مری ہوگئی سب بسر
نمودار پیری ہوئی سر بسر

بہت ملک پر جان کھویا کیا
بہت فکر دنیا میں رویا کیا

وزیروں نے کی عرض کہ اے آفتاب!
نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب

عجب کیا کہ ہووے تمہارے خلف
کرو تم نہ اوقات اپنی تلف

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو
کہ قرآن میں آیا ہے لا تَقنَطُو

بلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو
نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

تسلی تو دی شاہ کو اس نمط
و لے اہلِ تنجیم کو بھیجے خط

نجومی و رمّال اور برہمن
غرض یاد تھا جن کو اس ڈھب کا فن

بلا کر اُنھیں شہہ کنے لے گئے
جونہیں روبہ روشہ کے سب وے گئے

کیا قاعدے سے نہوڑ کر سلام
کہا شہ نے: میں تم سے رکھتا ہوں کام

نکالو ذرا اپنی اپنی کتاب
مرا ہے سوال اُس کا لکھو جواب

نصیبوں میں دیکھو تو میرے کہیں
کسی سے بھی اولاد ہے یا نہیں

یہ سن کر، وے رمّالِ طالع شناس
لگے کھینچنے رائچے بے قیاس

جماعت نے رمّال کی عرض کی
کہ ہے گھر میں اُمّید کے کچھ خوشی

ہے اس بات پر اجتماع تمام
کہ طالع میں فرزند ہے تیرے نام

نجومی بھی کہنے لگے در جواب
کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب

نحوست کے دن سب گئے ہیں نکل
عمل اپنا سب کر چکا ہے زُحل

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار
تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار

جنم پترا شاہ کا دیکھ کر
تلا اور برچھک پہ کر کر نظر

کہا: رام جی کی ہے تم پر دیا
چنّدر ماسا بالک ترے ہووے گا

ولیکن مُقدّر ہے کچھ اور بھی
کہ ہیں اس بھلے میں بُرے طور بھی

یہ لڑکا تو ہوگا، ولے کیا کہیں
خطر ہے اُسے بارھویں برس میں

نہ آوے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام

کہا شہ نے، یہ سن کے اُن کے تئیں
کہو، جی کا خطرہ تو اُس کو نہیں؟

کہا: جان کی سب طرح خیر ہے
مگر دشت غربت کی کچھ سیر ہے

اُسی سال میں یہ تماشا سنو
رہا حَمل اک زوجۂ شاہ کو

گئے نو مہینے جب اس پر گزر
ہوا گھر میں شہ کے تولُّد پسر

عجب صاحب حسن پیدا ہوا
جسے مہرومہ دیکھ شیدا ہوا

نظر کو نہ ہو حسن پر اس کے تاب
اُسے دیکھ بے تاب ہو آفتاب

ہوا وہ جو اُس شکل سے دل پذیر
رکھا نام اس کا شہ بے نظیر

(ماخوذ از سحرالبیان)

مثنوی: مثنوی اردو شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ مسلسل مضامین کے بیان کیلئے مثنوی سے زیادہ کوئی صنف موزوں نہیں ہے۔ یہ مقررہ بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اور ہر شعر

میں قافیہ بدلتا رہتا ہے۔ اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔

مثنوی میں عام طور پر کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو رزمیہ، عاشقانہ، تاریخی یا تخیلی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی میں مناظر قدرت، عام واقعات، اصلاحی موضوعات اور فلسفیانہ مضامین بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ اردو کے صف اول کے مثنوی نگاروں میں میر حسن، دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق لکھنوی کا نام آتا ہے۔

معنی اور اشارے

شہنشاہ گیتی پناہ = سارے جہاں کا بادشاہ، بادشاہوں کا بادشاہ

حشمت و جاہ = شان وشوکت

مال و منال = دولت اور اسباب

فرخندہ حال = خوش حال

باج = محصول، ٹیکس

خطا اور ختن = ملکوں کے نام

رعیت = عوام

آسودہ = خوش حال

مینو سواد = خوبصورت جنّت

اہل حرفہ = ہنر والے، کاریگر

ازدحام = بھیڑ

زیست = زندگی

مدام = ہمیشہ

نہڑ کرنا = تسلیم بجالانا

اضطراب = پریشانی

اہلِ تنجیم = علم نجوم کے ماہرین

رمّال = علم رمل کا ماہر ، جوتشی

طالع شناس = قسمت پہنچاننے والا

نحوست = بدنصیبی، نامبارک

زُحل = ستارہ جو نامبارک سمجھا جاتا ہے۔

تُلا = ترازہ، میزان، ستارے کا نام

برچھک = آسمان کا آٹھواں مقام یا برج

حمل ٹھہرنا = حاملہ ہونا

سوالات: (الف)

1) شہنشاہ گیتی پناہ کی شان وشوکت بیان کیجئے۔

2) بادشاہ کو باج اوخراج کون دیتے تھے؟

3) بادشاہ کا شہر کیسا تھا اور رعیّت کی کیا حالت تھی؟

4) بادشاہ کو کس بات کا غم تھا؟

5) بادشاہ نے وزیروں کو کیوں بلایا اور ان سے کیا کہا؟

6) وزیروں نے بادشاہ سے کیا درخواست کی؟

7) بخومی، رمّال اور برہمن کیوں بلائے گئے؟

8) انہوں نے بادشاہ کی جنم پتری دیکھ کر کیا کہا؟

9) بخومیوں نے لڑکے سے متعلق کیا پیش گوئی کی؟

10) لڑکا کیسا تھا؟ اور بادشاہ نے اس کا کیا نام رکھا۔

(ب) 1) شاعر نے شہنشاہ گیتی پناہ کے مال واسباب، فوج اور شہر کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے۔ تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

2) مثنوی ''شہنشاہ گیتی پناہ'' کا خلاصہ تحریر کیجیے؟

حضرت علی اکبر کی شہادت

(مرثیہ)

میر انیسؔ

میر ببر علی انیسؔ 1802ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ مگر جلد ہی اپنے باپ کے ساتھ لکھنو چلے گئے۔ جہاں انھوں نے مشہور علماء سے فارسی اور عربی پڑھی اور تربیت پائی۔ انیسؔ کے والد خلیقؔ خود ایک بڑے شاعر اور مرثیہ گو تھے اسلئے انیس کو مناسب ماحول ملا۔ باپ کی خواہش کے مطابق انیس نے مرثیہ نگاری شروع کی اور جلد ہی نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ انیس کا طرز بیان بہت سادہ اور موثر ہے۔ کلام سلجھا ہوا سلاست، فصاحت اور محاورات سے لبریز ہے۔ انہیں زبان پر بے پناہ قدرت تھی اور واقعہ نگاری اور منظر کشی میں کمال حاصل تھا۔

انیس اپنے اصولوں کو عزیز رکھتے تھے۔ نہایت قناعت پسند اور منکسر المزاج تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لکھنو میں گزارا۔ لکھنو کے باہر صرف الہ آباد، بنارس، پٹنہ اور حیدر آباد گئے۔ جہاں ان کی نہایت قدر ہوئی۔ انیس نے لکھنو ہی میں 1874ء میں انتقال کیا۔

جس دم سنی حسین نے یہ جاں گزا صدا
صابر اگرچہ تھے یہ کلیجہ اُلٹ گیا
ہاتھوں سے دل کو تھام کے دوڑے برہنہ پا
نعرہ کیا کہ اے علی اکبر کروں میں کیا

مل کر غریب و بیکس وتنہا سے جائیو
آ لے ضعیف باپ تو دنیا سے جائیو

ہے ہے مرے شفیق پسر مہرباں پسر
خوشرو پسر سعید پسر قدرداں پسر
مادر کا چین، باپ کا آرام جاں پسر
کم گو پسر، شہید پسر، نوجواں پسر

مقتل کدھر ہے کوئی بتاتا نہیں مجھے
اے نور عین کچھ نظر آتا نہیں مجھے

مجھ کو غریب دشت بلا کہہ کے پھر پکار
اک بار یا شہ دوسرا کہہ کے پھر پکار
اے شیر سید الشہدا کہہ کے پھر پکار
صدقہ ہو باپ یا ابنا کہہ کے پکار

میری بھی جان تن سے ترے ساتھ جائے گی
مرجاؤں گا یہیں جو نہ آواز آئے گی

کچھ ہوش دست و پا کا نہیں بے حواس ہوں
زخمی ہے قلب کشتۂ اندوہ و یاس ہوں
غمگیں ہوں مردہ دل ہوں حزین واداس ہوں
دم توڑو تم، تو ہے غضب اور میں نہ پاس ہوں

کیونکر قرار آئے دلِ ناصبور کو
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے آنکھوں کے نور کو

دوڑے یہ بات کہہ کے جو سلطان بحر و بر
بیٹے کی لاش باپ نے دیکھی لہو میں تر
اٹھا یہ دل میں درد کہ خم ہوگئی کمر
دیکھا جو زخم منہ کے قریب آ گیا جگر

تڑپے جو گر کے اور تڑپ کے ٹھہر گئے
غل پڑ گیا صفوں میں کہ شبیر مر گئے

ہوش آیا تین ساعت کامل کے بعد جب
دیکھا کہ مٹ رہی ہے شبیہ رسولؐ اب
آنسو بہا کے رکھ دئے بیٹے کے لب پہ لب
چلّاتے تھے کہ چھوڑ چلے ہم کو ہے غضب

دل سے گلے لپٹنے کی حسرت نکال دو
باہیں اٹھا کے باپ کی گردن میں ڈال دو

اکبر نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخ پدر
گالوں پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے ادھر ادھر
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر سرِ پسر
روتے ہو کس کے واسطے اے غیرت قمر

یاں سے اٹھا کے آل پیمبر میں لے چلیں
غم ماں کا ہے تو آؤ تمہیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت اتنی کہاں اے شہ امم
اب کیجئے قبلہ رو کہ نکلتا ہے تن سے دم
دولت ملی کہ دیکھ لئے آپ کے قدم
غیر از غم فراق مجھے کچھ نہیں ہے غم

ساتھ آئے تھے جو چاہنے والے وہ دور ہیں
روتا ہوں اس لئے کہ اکیلے حضور ہیں

شہ نے کہا مرے لئے بیٹا نہ روؤ بس
ہو گا جہاں سے جانے میں تھوڑا سا پیش و پس
دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کی کچھ ہوس
میرے لئے ہے اب دمِ خنجر ہر اک نفس

اکبر ترے الم سے جگر چاک چاک ہے
جب تو نہ ہو تو باپ کے جینے پر خاک ہے

یہ بات سن کے لینے لگا ہچکیاں پسر
سوکھی زباں دکھائی کہ پیاسا ہوں اے پدر
زردی اجل کی چھا گئی چہرے پہ سربسر
دوبار لی کراہ کے کروٹ ادھر ادھر

دنیا سے انتقال ہوا نورعین کا
ہنگام ظہر تھا کہ لٹا گھر حسین کا

مرثیہ: وہ نظم جس میں مرنے والے کی خوبیاں اور اوصاف بیان کیئے جائیں اوراس کی موت پر اظہار غم کیا جائے۔

اُردو شاعری میں مرثیہ خاص طور پر اس نظم کو کہتے ہیں جسمیں حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقائے کربلا کی شہادت کا حال بیان کیا جائے اور اس پر گہرے غم کا اظہار کیا جائے۔میر انیسؔ اور مرزا دبیر اردو کے بڑے مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔انیسؔ نے مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

I۔ معنی اور اشارے

صدا	=	آواز
صابر	=	صبر کرنے والا
ضعیف	=	کمزور، بوڑھا
خوشرو	=	خوبصورت
مادر	=	ماں
مقتل	=	قتل کرنے کی جگہ
دشت	=	جنگل
سیدالشہدا	=	شہیدوں کے سردار
حزیں	=	غمگین، رنجیدہ
اندوہ	=	غم
ناصبور	=	بے صبر
کلیجہ الٹ گیا	=	بے چین ہو گئے
برہنے پا	=	ننگے پاؤں
پسر	=	بیٹا
سعید	=	نیک
کم گو	=	کم بات کرنے والا

نورعین = آنکھوں کی روشنی۔ مراد، بیٹا

شہ دوسرا = دونوں جہاں کے بادشاہ

کشتہ = مارا ہوا

دست و پا = ہاتھ پاؤں

یاس = ناامیدی

بحر و بر = سمندر اور زمین

خم ہوگئی = جھک گئی

شبیہ رسول = حضرت علی اکبرؓ کی شکل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتی تھی۔

الم = غم

ہنگام = وقت

مہلت = فرصت

لب = ہونٹ

غیرت قمر = جن سے چاند بھی شرما جائے

آل = اولاد، خاندان

پس و پیش = تشویش، تکلیف

اجل = موت

سوالات :

II (الف)

1) حضرت علی اکبر کی شہادت کا حال سن کر حضرت امام حسینؓ پر کیا گزری ؟

2) اس نظم کے دوسرے بند میں آپؓ نے اپنے گہرے غم کا اظہار کن الفاظ میں کیا ؟

3) بیٹے کی لاش کو دیکھنے کے بعد حضرت امام حسینؓ کا کیا حال ہوا ؟

4) علی اکبر نے جب آخری بار آنکھیں کھولیں تو حضرت امام حسینؓ نے اُن سے کیا کہا ؟

5) علی اکبر نے اس کا کیا جواب دیا ؟

6) اس کے بعد علی اکبر کا کیا حال ہوا ؟

(ب) ''دیکھا کہ مٹ رہی ہے شبیہ رسولؐ اب'' اس مصرعہ میں انیسؔ نے حضرت علی اکبر کو شبیہ رسولؐ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی اکبر کی صورت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی جلتی تھی۔

اس طرح حضرت علی اکبر کی تعریف میں شاعر نے مختلف قسم کے ناموں اور خطابات کا استعمال کیا ہے۔ اس پر غور کیجیے۔

شہر آشوب

نظیر اکبر آبادی

نام ولی محمد تھا اور تخلص نظیر۔ 1735ء اور 1740ء کے درمیان دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں یتیم ہوگئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ و تاراج کیا تو نظیر اپنے خاندان کے ساتھ اکبر آباد، آگرہ منتقل ہوگئے۔ باقی زندگی آگرے میں گذاری۔ اس اعتبار سے انہیں نظیر اکبر آبادی کہا جاتا ہے۔ نظیر فقیر منش، قناعت پسند آدمی تھے۔ وہ کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ معلّمی پیشہ تھا، لالہ بلاس رائے کے بچّوں کو پڑھاتے تھے۔ نظیر نے طویل عمر پائی۔ بڑھاپے میں فالج کا اثر ہوا۔ اسی بیماری میں انتقال کیا۔ ان کے احباب اور ملنے جلنے والوں کا حلقہ وسیع تھا۔ جس میں ہر طبقے اور پیشے و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ وہ عوامی شاعر تھے انھوں نے اپنی نظموں میں انسانوں کی زندگی، ان کے دُکھ سکھ، رسم و رواج، تقریبات تیوہاروں اور مختلف رسموں کی کیفیات پر دل چسپ نظمیں لکھیں۔ نظم کے علاوہ وہ غزل بھی کہتے تھے۔ غزل میں ان کا منفرد رنگ تھا۔

اس شہر آشوب میں نظیر نے آگرے کی تباہی کو بیان کیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے دلّی کے ساتھ آگرے پر بھی مصیبتیں آئی تھیں جس کو نظیر اکبر آبادی نے موثر انداز میں تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے۔ اردو میں یہ پہلا شہر آشوب ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کی بدحالی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند
ہو کس طرح نہ منھ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح کی بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

صراف و بنیے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب اُدھار
بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنے دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کی کوڑی نہ ہاتھ آئے
بے کار کب تلک کوئی قرض و اُدھار کھائے
دیکھو جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے

آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

جتنے سپاہی یاں تھے وہ جانے کدھر گئے
دکن تیئں نکل گئے یا پیش تر گئے
ہتھیار بیچ، ہو کے گدا گر بکھر گئے
جب گھوڑے بھالے والے بھی یوں در بدر گئے
پھر کون پوچھے ان کو جواب ہیں کٹار بند

معنی اور اشارے

سخن	=	بات، گفتگو، کلام
طبع	=	طبیعت
لیل ونہار	=	رات اور دن
موج دار	=	موجیں مارنے والا
جوں	=	جیسے، مانند
بند	=	پانی کو روکنے کے لئے جو بندش کی جاتی ہے
صراف	=	سونا چاندی پرکھنے والا، مہاجن
تئیں	=	طرف
پیش تر	=	آگے

کٹار = خنجر

کٹار بند = پیادہ سپاہی جس کے پاس صرف کٹار ہوتی تھی۔

شہر آشوب: ''اردو شاعری کی ایک خاص صنف ہے جس میں ملک کی تباہی و بربادی ملک والوں کی پریشان حالی اور مصیبتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔شاعر نے جب ان حالات سے متاثر ہوتا ہے۔تو ملک کی پریشانی اور بدحالی کا ذکر اپنے اشعار میں کرنے لگتا ہے۔

سوالات:

I ۔ (الف)

1) آگرے کی خلق کا روزگار بند ہو چکا تو شاعر نے ان حالات کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے؟

2) بے روزگاری سے شہر کا کیا حال تھا؟

3) سیٹھ اور ساہوکار پر کاروبار بند ہو جانے سے کیا گزری؟

4) شہر بدحالی کی بدولت سپاہی کس حال میں شہر چھوڑ کر نکل گئے؟

5) شاعر یہ کیوں کہتا ہے: ''دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند''

(ب) نظیر نے شہر کی بدحالی اور پریشانی کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے تفصیل سے لکھئے۔

شکوہ

شیخ محمد اقبالؔ

شیخ محمد اقبالؔ 1877ء میں سیال کوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ انگریزی مشن اسکول سے انٹرنس کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن کالج سے ایف.اے. پاس کیا۔ لاہور سے بی.اے. کی ڈگری لی۔ پہلے اورینٹل کالج اور بعد میں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

اعلیٰ تعلیم کا شوق انہیں انگلستان لے گیا۔ کیمبرج سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

1908ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ اقبال کو بچپن ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ ابتدا میں انہوں نے حضرت داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں انہوں نے شاعری کی۔ اردو میں بہترین نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ فارسی کے ذریعے ان کی شہرت ہندوستان کے باہر ایران روم اور انگلستان تک پہنچی۔ ان کے فارسی کلام کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو کا یہ مایۂ ناز شاعر طویل بیماری کے بعد 1938ء میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ بانگ درا، ضرب کلیم، بال جبرئیل اور ارمغان حجاز ان کے اردو کلام کے مجموعے ہیں۔

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گِلا بھی سن لے

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر؟

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا!

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی اہل چیں چین میں، ایراں میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی، وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں! خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟
اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہوئی؟
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَاللہُ اَحَدُ کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لیکر صفت جام پھرے
کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجکو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے　　　نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے　　　تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں!

سوالات:

I۔ (الف)

1) شاعر اقبال اپنے دل کا درد خدا سے کس طرح سناتا ہے؟

2) اسلام سے پہلے توحید والوں کا حال شاعر نے کن الفاظ میں بیان کیا ہے؟

3) اسلام کے نام پر جان دینے والوں کا حال شاعر نے کس طرح بیان کیا ہے؟

4) شاعر نے جہاد کرنے والوں کے کارنامے کن الفاظ میں بیان کئے ہیں؟

5) عین لڑائی میں نماز کا وقت آجاتا تو مجاہدین کیا کرتے تھے؟

6) اس نظم کے آخری بند کا مطلب سمجھائے؟

(ب) نظم ''شکوہ'' میں اقبالؔ نے خدا سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے کن کارناموں کو گنوایا ہے تفصیل سے لکھیے۔

II۔ یہ نظم ''شکوہ'' علامہ اقبالؔ کی ایک مشہور اور معرکتہ الآ را نظم کا ایک حصّہ ہے اس نظم میں شاعر نے خدا سے خطاب کرتے ہوئے بڑی بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر دلنشین انداز میں کیا ہے۔اس نظم سے مسلمانوں کے ماضی کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم کو غور سے پڑھیے اور دل کو چھو لینے والے اشعار کو نوٹ کیجیے۔

(ب) ''مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے'' اس مصرعہ میں شاعر نے توحید کے متوالوں کا ذکر بڑے اچھے انداز سے کیا ہے۔توحید کے دیوانے توحید کے نام پر اس کی مئے کو لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرتے رہے اور سب کو جام توحید سے سرشار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

آدمی نامہ

نظیر اکبر آبادی

ولی محمد نظیر اکبر آبادی 1740ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں آگرے چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ آٹھ زبانیں جانتے تھے۔ اور ایسی جانتے تھے کہ ان میں شعر کہتے تھے۔ خوش نویسی، فن سپہ گری اور علم ہیئت پر عبور تھا۔ طب میں بھی دخل رکھتے تھے۔

طبیعت فقیرانہ پائی تھی، واجد علی شاہ، راجہ بھرت پور اور کئی رئیسوں نے بلایا، نہیں گئے۔ اور ساری عمر بچوں کو پڑھاتے گزار دی۔

نظیر نے بہت لکھا لیکن اپنا کلام محفوظ نہیں کیا۔ اب جو کلام ملتا ہے، وہ ہے۔ جو اُن کے شاگردوں نے اپنے طور پر اکٹھا کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کلیات کے علاوہ تین مکمل دیوان تھے۔ دو اُردو میں اور ایک فارسی میں۔ نثر میں بھی نو کتابیں لکھی تھیں۔

اُن کی شاعری کا رنگ اردو کے تمام شاعروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے عام زندگی کے بارے میں لکھا، عام آدمی کیلئے لکھا اور عام آدمی کی زبان میں لکھا۔ اُنکی شاعری کے موضوعات کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے۔ جتنی زندگی وسیع ہے۔ وہ اُردو کے پہلے عوامی شاعر ہیں۔ اور عوام ہی نے انھیں زندہ رکھا۔

اک آدمی ہیں، جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں — روپے کے اُن کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں — کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار — نہلا دھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، روتے ہیں زارزار — سب آدمی ہی کرتے ہیں، مُردے کا کاروبار
اور وہ جو مرگیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے، شاہ تا وزیر — ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے، اے نظیرؔ
اور سب میں جو بُرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

معنی اور اشارے

گدا = فقیر

زردار = دولت مند

نقیب = خبر دینے والا، بادشاہ یا اُمرا کی سواری کے آگے پکارتے جانے والا یا کسی کی باریابی کے موقع پر بلند آواز میں پکارنے والا

بےنوا = بےکس، فقیر

پیادہ = پیدل، ہرکارہ

خطبہ خواں = خطبہ پڑھنے والا، خطیب

اک آدمی ہیں، جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے اُن کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں　　کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار　　نہلا دھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، روتے ہیں زار زار　　سب آدمی ہی کرتے ہیں، مُردے کا کاروبار
اور وہ جو مرگیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے، شاہ تا وزیر　　ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر　　اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے، اے نظیرؔ
اور سب میں جو بُرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

معنی اور اشارے

گدا = فقیر

زردار = دولت مند

نقیب = خبر دینے والا، بادشاہ یا اُمرا کی سواری کے آگے پکارتے جانے والا یا کسی کی باریابی کے موقع پر بلند آواز میں پکارنے والا

بے نوا = بے کس، فقیر

پیادہ = پیدل، ہرکارہ

خطبہ خواں = خطبہ پڑھنے والا، خطیب

بے بہا = انمول، قیمتی

تاڑنا = بھانپنا

زرق برق = چمک دمک

تیغ = تلوار

فرق = سَر

پگڑی اُتارنا = بےعزتی کرنا

جھمکنا = چمکنا

صید = شکار

غرب، مغرب، شرق = مشرق

سوالات:

I۔ (الف)

1) نظیر نے آدمی کی کئی قسمیں گنائی ہیں ان میں سے چند کے نام بتایئے؟

2) نظیر کہتے ہیں کہ اشراف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر، ہر شخص آدمی ہے،

یہ کہاں تک درست ہے؟

3) نظیر کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ اس نظم کے پڑھنے کے بعد آپ کی کیا رائے ہے؟

4) تیسرے، پانچویں اور ساتویں بند کی تشریح کیجیے۔

(ب) آدمی نامہ میں شاعر نے آدمی کے مختلف روپ کن الفاظ میں ظاہر کیے ہیں تفصیل سے لکھیے۔

II۔ نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری اُردو کے تمام شاعروں سے الگ ہے۔ آپ نے عوام کے لئے عوام کی زبان میں شاعری کی ہے۔ اسی لئے آپ کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے ٹھیلے میلے عید 'برات' دیوالی اور دسہرہ جیسے تہوار پر بھی آپ نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ آپ کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

وطن

جوشؔ ملیح آبادی

شبیر حسن خاں جوشؔ 1896ء ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ جس کے بعد سیتاپور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرے کے اسکولوں میں زیرِ تعلیم رہے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران مرزا ہادی رسوا سے فارسی کے علاوہ، انگریزی ادب اور فلسفہ باقاعدہ پڑھا۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمے میں کوئی دس برس ناظرِ ادبی کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ایک نظم کی وجہ سے بادشاہِ وقت کا عتاب ہوا اور حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ مختلف ریاستوں میں قسمت آزمائی کے بعد دہلی پہنچے اور سروجنی نائڈو کی ایما اور مالی امداد سے کلیم جاری کیا، جو چار برس تک کامیابی سے نکلتا رہا۔ کچھ دن فلمی دنیا سے وابستہ رہے اور آزادی کے بعد ''آج کل'' کے مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ 1955ء میں پاکستانی شہریت اختیار کر لی۔

جوشؔ، اقبالؔ کے بعد اُردو نظم کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اُنھیں شاعرِ شباب، شاعرِ فطرت اور شاعرِ انقلاب کہا جاتا ہے۔ اُنکے ہاں یہ تینوں رنگ ملتے ہیں۔ اور پورے آب وتاب کے ساتھ ملتے ہیں، اُن کی سیاسی شاعری بڑی جاندار اور ولولہ انگیز ہوتی ہے۔ انھوں نے جنگِ آزادی کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ

لیا ہے۔زبان پر اُن کو بے پناہ قدرت تھی۔وہ تشبیہات کے بادشاہ تھے۔اُن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں سے چند یہ ہیں: نقش ونگار، شعلہ وشبنم، حرف وحکایت، رامش ورنگ، سنبل وسلاسل، سرود وخروش، سموم وصبا، اُنھوں نے اپنی سوانح، یادوں کی برات، کے نام سے شائع کی ہے۔

اے وطن آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں   آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے ترے جلووں کے تماشائی ہیں   ہم تو بچپن سے ترے عاشق وسودائی ہیں

بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو   تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو   تیرے ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو

خندۂ گُل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی

تجھ سے منہ موڑ کے منہ اپنا دکھائیں گے کہاں؟   گھر جو چھوڑیں گے تو پھر چھاؤنی چھائیں گے کہاں؟
بزم اغیار میں آرام یہ پائیں گے کہاں؟   تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائیں گے کہاں؟

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا؟
کس قدر تجھ سے ہے مضبوط یہ رشتہ اپنا؟

معنی اور اشارے

شیدائی = دیوانہ، فریفتہ

خندۂ گل = پھول کا کھلنا

تمنائی = آرزہ مند

رشتہ = تعلق

تماشائی = دیکھنے والا

نوشتہ = تحریر

چھاؤنی چھانا = ڈیرہ ڈالنا، قیام کرنا

سوالات:

I۔ (الف)

1) وطن پرستی کا جذبہ انسان کے دل میں کب سے ہوتا ہے؟

2) بچہ کس زبان میں بولنا سیکھتا ہے؟

3) کہاں کے مظاہر فطرت ہم کو حسن اور شباب سے آشنا کرتے ہیں؟

4) وطن سے منہ موڑنے پر کیا صورت حال پیش آتی ہے؟

5) ہماری قسمت کا نوشتہ کس کے ہاتھوں میں ہے؟

6) آخری بند کی تشریح کیجیے۔

(ب) اس نظم میں شاعر نے ''وطن'' کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے تفصیل سے لکھئے۔

II۔ یہ نظم جوش ملیح آبادی کے وطن پرستی کے جذبہ کو ظاہر کرتی ہے۔ شاعر کو اپنے وطن ہندوستان سے اس قدر محبت ہے کہ وہ ازل ہی سے اس کا تمنائی اور شیدائی ہے ہم کو بھی اپنے وطن ہندوستان کی سرزمین سے محبت کرنا اور یہاں کے رہنے والے ہر مذہب ''قوم'' رنگ ونسل اور مختلف زبان کے لوگوں سے محبت کرنی چاہیئے۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

جمہور کا اعلان نامہ

علی سردار جعفری

علی سردار جعفری 1913ء بلرام پور، ضلع گونڈہ میں پیدا ہوئے۔ اینگلو عربک کالج لکھنو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے شاعری اور سیاست سے دلچسپی لینی شروع کی اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا شمار اس تحریک کے بڑے رہنماؤں اور نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ نقاد بھی ہیں۔ ان کی نظم ونثر دونوں میں بڑی جان اور طاقت ہوتی ہے۔

''ایشیا جاگ اٹھا'' ''خون کی لکیر'' ''نئی دنیا کو سلام'' ''امن کا ستارہ'' ''پتھر کی دیوار'' ''ایک نواب اور'' ''پیرہن شرر'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی تنقیدی کتاب ترقی پسند ادب اپنے موضوع پر اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ ان کو مخدوم ادبی ایوارڈ کے علاوہ کئی اعتراز مل چکے ہیں۔

محبت کے جذبے اُبھاریں گے ہم　　پریشان زلفیں سنواریں گے ہم

عناصر کے گھوڑوں پہ ہو کر سوار　　کریں گے غریبی کے سینے پہ وار

سمندر سے موتی نکل آئیں گے　　زمیں کے خزانے اُبل آئیں گے

گھٹاؤں میں تبدیل ہوگا دھواں　　برسنے لگیں کے ستارے یہاں

نہ پھر خوف ہوگا نہ پھر احتیاج　　نئے سر سے تعمیر ہوگا سماج

یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی　　کسانوں کی دنیا بدل جائے گی

رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار　　مصیبت سے چھٹ جائیں گے کامگار

نہ ہوگا مشینوں کا انساں غلام　　مشینوں پہ قبضہ کریں گے عوام

سجادیں گے چیزوں سے بازار ہم　　لگادیں گے دولت کے انبار ہم

پہنائیں گے بچوں کو رخت حریر　　ہمالہ سے لائیں۔گے ہم جوئے شیر

سنہرے دوپٹے اُڑھائیں گے ہم　　ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم

پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ　　جلیں گے ہراک گھر میں گھی کے چراغ

کریں گے یہاں رقص حسن و شباب　　زمیں پر اُتر آئے گا آفتاب

نئی دیں گے ماتھوں کو تنویر ہم
بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

معنی اور اشارے

جمہور	=	عوام
عناصر	=	عنصر کی جمع، آگ پانی ہوا اور مٹی
رخت حریر	=	ریشمی لباس
احتیاج	=	ضرورت
کامگار	=	مزدور
افلاس	=	غریبی
تنویر	=	روشنی، چمک
گھی کے چراغ جلانا	=	خوشی منانا
عناصر کے گھوڑوں پہ سوار	=	آگ پانی ہوا مٹی کو اپنے قبضہ میں کرنا

سوالات:

I۔ (الف)

1) عناصر کے گھوڑوں پر سوار ہونے سے کیا مراد ہے؟

2) انساں سے مشینوں کا غلام کب ہوتا ہے اور کب اس غلامی سے نجات ملتی ہے۔

3) افلاس اور بے روزگار سے متعلق شاعر کا خیال ظاہر کیجئے۔

4) ''گھی کے چراغ جلنے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5) شاعر بچوں کو کیا پہنانا چاہتا ہے؟

6) شاعر نے مستقبل کے بھارت کی کیسی تصویر پیش کی ہے؟

7) انسان کی تقدیر کیوں بدل جائے گی؟

(ب) نظم ''جمہور کا اعلان نامہ'' میں شاعر نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

II۔ اس نظم کا مرکزی خیال واضح کیجیے۔

قطعات

اختر انصاری

(1988 - 1909)

اختر انصاری بدایوں کے رہنے والے تھے۔ دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ اعلا تعلیم کے لئے لندن گئے مگر والد کی علالت کے باعث جلد واپس آ گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے اور پھر ٹریننگ کالج میں بحیثیت لیکچرر تقرر ہوا۔ 1974ء میں ریٹائر ہوئے اور آخری وقت تک علی گڑھ ہی میں رہے۔

1928ء میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اختر انصاری نے افسانے بھی لکھے اور تنقید بھی۔ لیکن انھیں شہرت قطعات سے ملی۔ ''ایک ادبی ڈائری''، ''افادی ادب''، ''غزل کی سرگزشت''، غزل اور غزل کی تعلیم''، ''مطالعہ تنقید''، ان کی نثری تصنیفات ہیں۔ ''نغمۂ روح''، ''روح عصر''، ''دہان زخم''، ''درد و داغ''، ''شعلہ بجام''، ''آبگینے'' اختر انصاری کے معروف شعری مجموعے ہیں۔

اختر انصاری نے شاعری میں غزل، نظم، رباعی اور قطعات میں طبع آزمائی کی ہے۔

فطرت

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی
وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اُس کی بزمِ عشرت میں
تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ دیتی ہے

دھوپ اور مینہ

ہلکی ہلکی پھوار کے دوران مین
دفعتاً سورج جو بے پردہ ہوا
میں نے یہ جانا کہ وحشت میں کوئی
روتے روتے کِھل کِھلا کر ہنس پڑا

آلامِ روزگار

تلخیاں، محرومیاں، ناکامیاں، ناداریاں
مُستزاد اُس غم پہ جس کا ناز پروردہ ہوں میں
یہ خس وخاشاک بھی یا رب! مجھے منظور ہے
صدقے تیری دین کے! بہتا ہوا دریا ہوں میں

دل کا باغ

اپنے دل کے باغ سے چن چن کے پھول
عمر بھر اک ہار میں گوندھا کیا
کِس کو پہناؤں گا، یہ سوچا نہیں
آہ، اے اخترؔ یہ میں نے کیا کیا

قطعہ

رباعی کی طرح قطعہ بھی عام طور پر چار مصرعوں کی نظم ہوتا ہے۔ لیکن رباعی اور قطعے میں دو باتوں کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔ رباعی کے لئے کچھ بحریں مخصوص ہیں۔ جبکہ قطعہ کسی بھی بحر میں کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے، جبکہ قطعہ میں یہ شرط نہیں دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قطعہ کلاسیکی شاعروں کے یہاں عموماً غزل کے اشعار میں ملتا ہے۔ قطعہ بند اشعار غزل کے اندر دو بھی ہو سکتے ہیں اور دو سے زائد بھی۔ لیکن آج کل کے شعرا نے قطعے کی رباعی کی طرح صرف چار مصرعوں سے مخصوص کر دیا ہے۔ رباعی کے برعکس قطعے کو کوئی مخصوص بحر نہیں ہوتی۔

معنی اور اشارے

غم دیدہ	=	غم گیں، افسردہ
دفعتاً	=	اچانک
وحشت	=	دیوانگی، جنون، آوارگی
مُستزاد	=	زیادہ بڑھایا گیا، کسی چیز کے ساتھ دوسری چیز کا اضافہ کرنا
پروردہ	=	پالا ہوا، پرورش کیا ہوا
خس وخاشاک	=	سوکھی گھاس، جھاڑ پھوس
گوندھا	=	ہار بنانے کے لئے پھولوں کو دھاگے میں پرونا

غور کرنے کی بات

- ''فطرت'' میں شاعر نے جنگل کی خوش گوار فضا کو 'بزم عشرت' کہا ہے۔ ریشمی آنچل پُر کیف ماحول کا استعارہ ہے۔
- ''دھوپ اور مینہ'' میں پھوار میں 'ڈ' کی آواز 'پھ' کے ساتھ مل کر خفیف نکلے گی واضح نہیں ہوگی۔
- ''آلام روزگار'' میں شاعر نے اپنی زندگی کے رنج و آلام کو خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔

مشق اور مطالعہ

1) جنگل کی دیوی کسے کہتے ہے؟

2) سورج کے بے پردہ ہونے اور وحشت میں کھل کھلا کر ہنسنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3) شاعر نے اپنے آپ کو غم کا ناز پروردہ کیوں کہا ہے؟

4) ''دل کے باغ سے چن چن کے پھول'' سے کس کیفیت کا اظہار ہوتا ہے؟

یہ چاروں قطعے مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں ایک مشترک کیفیت ہے۔اس کیفیت کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

غزل

ولؔی

قدیم اُردو یعنی دکنی زبان کے مشہور و معروف اور ممتاز شاعر ولؔی کا اصلی وطن احمد آباد، گجرات تھا، مگر آپ نے کبھی اورنگ آباد، کبھی برہان پور اور کبھی دلّی میں بھی بود و باش اختیار کی۔ اس طرح آپ نے اردو کا چراغ ہر جگہ روشن کیا۔ آپ کی زبان گجرات اور دکن میں بولی جانے والی اُردو تھی۔

ولؔی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ آپ کے بہت سے شعر صاف اور سادہ بلکہ آج کے دور کے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو ''اردو شاعری کا باوا آدم'' بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کا دیوان 1720ء میں جب دلّی پہنچا، تو آپ کی وجہ سے بہت سے شاعر اُردو میں شعر کہنے لگے اور شاعری کا چرچا عام ہوگیا۔ آپ کا کلیات کئی بار چھپ چکا ہے۔

مُفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کیوں کر حاصل ہو مجھ کوں جمعیّت
زُلف تیری قرار کھوتی ہے

ہر سحر، شوخ کی نگہ کی شراب
مجھ انکھاں کا خُمار کھوتی ہے

کیوں کر ملنا صنم کا ترک کروں؟
دل بری اختیار کھوتی ہے

اے وؔلی! آب اُس پری رو کی
مجھ سنے کا غُبار کھوتی ہے

غزل : لفظ ''غزل'' کے کئی معنی ہیں۔محبوب سے باتیں کرنا، عورتوں کی باتیں کرنا۔عورتوں سے باتیں کرنا۔اس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر غزل میں عشقیہ باتیں بیان کی جاتی ہیں۔لیکن آہستہ آہستہ غزل میں دوسرے مضامین بھی داخل ہوتے گئے اور آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل میں تقریباً ہر طرح کی باتیں بیان ہوسکتی ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ غزل آج بھی اردو کی سب سے زیادہ مقبول صنفِ سخن ہے۔
غزل کا ہر شعر مفہوم کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے۔

غزل کی ابتدا قصیدے سے ہوئی۔قدیم عربی شاعری میں قصیدے کے ابتدائی اشعار میں بعض شعر عشقیہ یا بہاریہ ہوتے ہیں۔قصیدے کا پہلا حصہ ''تشبیب'' کہلاتا ہے۔رفتہ رفتہ تشبیب کے اشعار قصیدے کے علاوہ آزادانہ بھی کہے جانے لگے اور

اس طرح غزل وجود میں آئی۔

جس طرح غزل میں مضامین کی قید نہیں ہے اسی طرح اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔ عام طور پر غزل میں پانچ سات شعر ہوتے ہیں۔ لیکن بعض غزلوں میں زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ہی بحر اور ردیف وقافیے میں شاعر ایک سے زیادہ غزلیں کہہ دیتا ہے۔ ایسی غزلوں کو ''دوغزلہ''، ''سہ غزلہ'' ''چار غزلہ'' وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اصطلاح میں غزل کا پہلا شعر ''مطلع'' کہلاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مطلعے کے بعد بھی مطلع ہوسکتا ہے۔ جس طرح غزل کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے اسی طرح مطلعوں کی تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔ مطلعے کے بعد آنے والے مطلعے کو ''حسن مطلع'' کہتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ اس شعر کو ''مقطع'' کہتے ہیں۔ غزل کا سب سے اچھا شعر ''بیت الغزل'' یا ''شاہ بیت'' کہلاتا ہے۔ جس غزل میں ردیف نہ ہو اور صرف قافیے ہوں وہ ''غیر مردّف'' کہلاتی ہے۔ وہ بحر، ردیف اور قافیہ جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے، اسے غزل کی ''زمین'' کہتے ہیں۔

مطلع: غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں

مقطع: غزل کا وہ شعر جسمیں شاعر اپنا تخلص ظاہر کرتا ہے۔ اسے مقطع کہتے ہیں

قافیہ: ایک ہی وزن اور حرکت الفاظ جیسے نام، شام، جام وغیرہ۔

ردیف: وہ الفاظ جو غزل یا قصیدہ کے آخر میں بار بار آتے ہیں۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر میں ''ہوا'' اور ''دوا'' قافیے ہیں اور ''ہے'' ردیف ہے۔

مصرعہ اولیٰ: شعر کا پہلا مصرعہ

مصرعہ ثانی: شعر کا دوسرا مصرعہ

ع : یہ علامت ہے مصرعہ لکھنے کی

ے : یہ علامت ہے شعر لکھنے کی

سوالات:

1) مُفلسی کی بُرائی بیان کرتے ہوئے شاعر کیا کہتا ہے؟

2) شاعر کو کیوں جمعیت حاصل نہیں ہے؟

3) شاعر نے اپنے محبوب کی شوخ نگہہ کی تعریف کیسے کی ہے؟

4) شاعر کیوں اپنے محبوب سے ملنے سے باز نہیں آتا؟

غزل

خواجہ میر درد

نام : خواجہ میر تخلص : درد

والد کا نام : خواجہ ناصر عندلیب پیدائش: 1133ھ بمقام دلی

وفات : 1199ھ

خواجہ میر درد تصوف کے بادشاہ اور صوفی شاعر ہیں۔ آپ دلی کے رہنے والے تھے دلی اور دلی والوں پر جب آفت آئی تو پھر بھی آپ نے دلی کو نہیں چھوڑا۔ طبیعت میں توکل انکساری اور استغناء زیادہ تھا چھوٹی بحروں میں غضب کے شعر کہتے ہیں۔ آپ کا کلام تصوف اور معرفت سے بھرپور ہے۔ آپ کی طبیعت کی طرح آپ کے کلام میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے۔

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
کس لئے آئے تھے کیا ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام اُن گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا! یاں کا بس
تم رہو اب، ہم تو اپنے گھر چلے

آہ بس مت جی جلا تب جانئے
جب ترا افسوں کوئی اُس پر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے

جوں شرر ہے، ہستی بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

سوالات

1) زندگی کو شاعر نے کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟

2) دنیا کا تماشہ دیکھ کر شاعر کیا کہتا ہے؟

3) دنیا میں آنے اور جانے کا احوال شاعر نے کس انداز سے بیان کیا ہے؟

4) ''جب تلک چل سکے ساغر چلے کا کیا مطلب ہے؟

5) غزل کے مقطع میں شاعر نے کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے؟

غزل

ذوقؔ

نام	شیخ محمد ابراہیم	تخلص :	ذوقؔ
پیدائش :	1789ء بمقام دلّی	وفات :	1854ء دلّی
والد کا نام	شیخ محمد رمضان	ذوقؔ کا خطاب:	''خاقانی ہند''

ذوقؔ کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ انیس (19) برس کی عمر میں شاہ دلی کے دربار میں قصیدہ سنا کر ''خاقانی ہند'' کا خطاب پایا۔ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی، بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد تھے۔ ان کے علاوہ داغؔ اور محمد حسین آزادؔ بھی آپ کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ذوقؔ شاعری کی، تمام اصناف پر قدرت رکھتے تھے لیکن قصیدہ میں کمال حاصل تھا۔ آپ کا کلام شوکت الفاظ نئی نئی ترکیبوں کی دلاویزی اور مضمون آفرینی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے

پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پر ہم جیسے بدقمار

جو چال ہم چلے وہ نہایت بُری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ

ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو، ہو وہی

دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ

تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہی اس چمن سے ذوقؔ

اپنی بلا سے بادِ صبا پھر کبھی چلے

سوالات:

1) انسان کیا دنیا میں اپنی خوشی سے آتا اور اپنی ہی خوشی سے چلا جاتا ہے؟ شاعر نے اس کا احوال کیسے بیان کیا ہے؟

2) اگر انسان کو حضرت خضرؑ کی سی لمبی عمر مل جائے تو موت کے وقت وہ کیا کہے گا؟

3) شاعر خرد پر فخر کرنے سے بچنے کی ہدایت کیوں کی ہے؟

4) دنیا میں کیا کسی نے راہ فنا میں ساتھ دیا ہے؟

غزل

مرزا غالبؔ

نام	: مرزا اسداللہ خاں	تخلص	: پہلے اسدؔ بعد غالبؔ

پیدائش : آگرہ، مسلسل دلّی میں قیام کی بدولت دہلوی کہلائے

وفات : 1869ء

والد کا نام : عبداللہ بیگ عرف مرزا دولھا

خطاب : مرزا نوشہ، نجم الدولہ دبیر الملک

تصانیف : دیوان غالبؔ (کلام کا مجموعہ)

خطوط کا مجموعہ : اردوئے معلّٰی عود ہندی

مرزا غالبؔ آگرے کے ایک اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں باپ اور چچا کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے نانا رئیس تھے۔ بچپن بڑے آرام سے گزرا۔ جلد ہی شادی ہوگئی اور آپ آگرہ سے دلی چلے آئے۔

غالبؔ نے غزل کو نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ آپ نے اپنے فکروفن سے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ اپنے آنے والے دور پر بھی اپنا گہرا اثر ڈالا۔ غالبؔ کے

یہاں انسانی دردمندی فلسفیانہ بے نیازی اور خوش طبعی ہے۔وہ اردو شاعری اورادب کی دولت ہیں۔آپ کا کلام علوئے تخیل، بلند پروازی اور طنز وظرافت کی شگفتگی سے مالامال ہے۔

دل ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش! پوچھو کہ "مدّعا کیا ہے؟"
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا، کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے، وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا" اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

سوالات:

1) شاعر دل ناداں سے کیا سوال کرتا ہے؟

2) شاعر اپنے معشوق کو بیزار دیکھ کر خدا سے کیا کہتا ہے؟

3) ”جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود“ کا کیا مطلب ہے؟

4) شاعر حسن اور مظاہر قدرت پر اپنی حیرت کا اظہار کس طرح کرتا ہے؟

5) شاعر کس سے وفا کی اُمید رکھتا ہے؟

6) شاعر اپنی جاں نثاری کا اظہار کرتے ہوئے محبوب سے کیا کہتا ہے؟

غزل

مومنؔ

نام : مومن خان تخلص : مومنؔ

پیدائش : 1800ء بمقام دلّی وفات : 1852ء

والد کا نام : حکیم غلام نبی خاں استاد کا نام: شاہ نصیرؔ

مومن خان مومنؔ عربی اور فارسی زبان کے ماہر تھے۔ علم طب اور نجوم میں کمال حاصل تھا۔ غالبؔ کے معاصرین میں سب سے ممتاز شاعر تھے۔ طبیعت میں قناعت اور خودداری تھی اسی لئے نہ تو دلی کے لال قلعہ کا رُخ کیا نہ کسی بادشاہ کی مدح کی۔ غزل کے علاوہ قصیدے بھی لکھے مگر کمال غزل میں حاصل کیا۔ آپ کا کلام عشق ومحبت کے جذبات اور احساسات کے علاوہ بلند پروازی اور نازک خیالی کے لئے مشہور ہے۔ رنگینی اور دلچسپی کے پہلو بھی زیادہ ہیں۔

ٹھانی تھی دل میں، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم پر کیا کریں؟ کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم؟
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا؟ کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں، کچھ اجنبی سے ہم؟
لے نام آرزو کا، تو دل سے نکال لیں مومنؔ نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

سوالات:

1) شاعر کسی سے نہ ملنے کا ارادہ کرنے کے باوجود پھر کیوں کسی سے ملتا ہے؟
2) شاعر کسی کو کسی سے ہنستے ہوئے دیکھ کر کیا کرتا ہے؟
3) غزل کے تیسرے شعر میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
4) شاعر اپنے دل کو کیوں اجنبی سا لگتا ہے؟

غزل

جگر مراد آبادی

نام	: علی سکندر	تخلص	: جگر
والد کا نام	: مولوی نظر علی	پیدائش	: 1890ء مراد آباد میں

اساتذہ : پہلے داغ کے شاگرد ہوئے پھر امیر اللہ تسلیم کے

کلام کے مجموعے : ''داغِ جگر' 'شعلۂ طور' اور آتشِ گل''

جگر مراد آبادی فطری شاعر تھے۔ شاعری والد سے ورثہ میں ملی تھی۔ ابتدائی دور کی شاعری سادگی برجستگی شوخی اور معاملہ بندی کا نمونہ ہے۔ دوسرے دور کی شاعری میں انتہائی دلکشی رنگین کیف و مستی کے اثرات گہرے ملتے ہیں۔ کلام حقائق و معارف سے بھی بھرپور ہے۔ کہیں کہیں سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

دل گیا، رونق حیات گئی • غم گیا ساری کائنات گئی
اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل رائگاں سعی التفات گئی
مرگ عاشق تو کچھ نہیں، لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی
ہم نے بھی وضعِ غم بدل ڈالی جب سے وہ طرز التفات گئی
ترک اُلفت بجا سہی، ناصح! لیکن اُس تک اگر یہ بات گئی!
نہیں ملتا مزاج دل ہم سے غالباً دور تک یہ بات گئی
قیدِ ہستی سے کب نجات جگر ! موت آئی، اگر حیات گئی

سوالات:

1) شاعر کو دل کے مقابلہ میں غم کے چلے جانے کا افسوس کیوں ہے؟
2) شاعر کے التفات کی کوشش کس طرح رائیگاں چلی گئی؟
3) شاعر نے وضع غم کیوں بدل ڈالی؟
4) شاعر ترک الفت سے کیوں گھبراتا ہے؟
5) غزل کے مقطع کا مطلب لکھیے۔

غزل

حسرتؔ موہانی

سیّد فضل الحسن حسرتؔ قصبہ موہان ضلع اُناؤ میں 1875ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی گھر پر پڑھی اور انگریزی تعلیم اسکول میں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ''اردوئے معلّیٰ'' نامی ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جو عرصہ دراز تک اُردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ ان کا ذہن ہر قسم کے تعصّبات سے پاک تھا۔ خودداری، بے باکی، اصول پسندی اور خلوص اُن کے نمایاں اوصاف تھے۔

حسرتؔ کو طالب علمی کے زمانے سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک رہے اُن کے رسالے ''اُردوئے معلّیٰ'' کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن آزادی کامل کے سلسلے میں وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔

حسرتؔ نے غزل کو تہذیبِ عاشقی کی شائستہ زبان سے آشنا کیا اور درد و اثر کے ساتھ شیرینی و دل کشی اور طرز ادا میں شگفتگی و لطافت پیدا کی۔ عشقیہ جذبات اور احساسات کی تصویر کشی واردات قلب کی عکاسی تصوف کی چاشنی سیاست کی ترجمانی آزادی کی تڑپ اور بقول خود ''زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود'' حسرت کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ 1951ء میں انتقال ہوا۔

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دوعالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑگیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

غمِ جہاں سے، جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے، جو سرفراز کرے

1) شعر میں نگاہ یار سے شاعر کی مراد کیا ہے؟

2) شاعر جنوں کا سلسلہ دراز کرنے کی دعا کیوں کرتا ہے؟

3) حسن کی کرشمہ سازی کیا گل کھلاتی ہے؟

4) شاعر معشوق کے ستم سے کیوں خوش ہے؟

5) اس شعر کا مطلب بیان کیجیے:

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

غزل

جاں نثار اختؔر

جاں نثار اختؔر کا شمار دورِ حاضر کے اہم اور مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا پورا نام سیّد جاں نثار حسین رضوی اور تخلص اختؔر تھا۔ آبائی وطن قصبہ خیرآباد، ضلع سیتاپور (یوپی) تھا۔ اُن کی پیدائش گوالیار میں 1914ء کو ہوئی۔ وہ ایک ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو کئی نسلوں سے علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ان کے والد مضطؔر خیرآبادی تھے۔ جاں نثار اختؔر کی تعلیم گوالیار اور علی گڑھ میں ہوئی۔ بھوپال میں لکچرر رہے۔ اس کے بعد ممبئی چلے گئے جہاں فلموں کیلئے گانے لکھے۔ ممبئی ہی میں 1976ء کو اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کے کلام کے سات مجموعے شائع ہوئے۔

فرصتِ کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

ہم نے صدیوں انھیں ذرّوں سے محبت کی ہے
چاند تاروں سے تو کل آنکھ لڑی ہے یارو

فاصلہ چند قدم کا ہے منالیں چل کر
صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو

کس کی دہلیز پہ لے جاکے سجائیں اس کو
بیچ رستے میں کوئی لاش پڑی ہے یارو

ان کے بن جی کے دکھادیں گے انھیں یونہی سہی
بات اتنی ہے کہ ضد آن پڑی ہے یارو

سوالات:

1) شاعر فرصت کار کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

2) شاعر نے کس سے محبت کی ہے اور اسکی آنکھ کس سے لڑی ہے؟

3) کون دور کھڑی ہے اور کس کو منا لینے کی بات کہی گئی ہے؟

4) ''ان کے بن جی کے دکھا دیں گے'' سے شاعر کی مراد کیا ہے؟

5) اس شعر کا مطلب بیان کیجئے:

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو
زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

غزل

عظمت اللہ سرمدی

پروفیسر سید عظمت اللہ سرمدی 19/ جولائی 1919ء کو ضلع کوئمبتور کے ایک قصبہ پرندلور میں پیدا ہوئے۔ آپ جنوبی ہند کے ایک ذی علم مشائخ خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور عربی فارسی اور دینی علوم کی اعلیٰ تعلیم جامعہ دار السلام عمر آباد سے حاصل کی۔ 1959ء میں شعبہ تاریخ اسلامی میں لکچرر ہوئے۔ اور 1978ء میں وائس پرنسپل بن کر وظیفہ یاب ہوئے۔ آپ کہنہ مشق شاعر تھے۔ جذبات کی عکاسی اور احساسات کی ترجمانی میں بڑی خوش سلیقگی سے کام لیتے تھے۔ آپ کے کلام میں فکری عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ آپ کو علاقائی زبان تامل پر بھی دست گاہ حاصل تھی۔ 5/ جون 1978ء کو بنگلور میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔

جل رہا ہے جو اک دیا دل میں　　اب اسی سے ہے کچھ ضیا دل میں

ہائے وہ زخم جو لگا دل میں　　بن کے ناسور رہ گیا دل میں

صلح کی بات ان سے کیا چھیڑوں　　ہے جو غصہ بھرا ہوا دل میں

کاش وہ خود ہی روبرو ہوتے　　کب تک آخر یہ سامنا دل میں

آہ کرنا بھی جرم ہے لیکن　　کب رہے دل کی یہ ہوا دل میں

کیا لگاوٹ ہے چشم جاناں سے　　تیر نکلا تو آ لگا دل میں

جو بلا آئی میرے گھر آئی　　جب سے الفت نے گھر کیا دل میں

ناخن غم گرہ کشا نکلا　　راز سربستہ یوں کھلا دل میں

ماہ و انجم نظر میں جچ نہ سکے　　ایک مہوش جو بس گیا دل میں

سرمدیؔ کی زباں سے جو نکلا
تیر کی طرح جا لگا دل میں

سوالات:

1) کس چیز سے شاعر کے دل میں کچھ ضیاء باقی ہے؟

2) زخم جو دل پر لگا وہ آخر کیا ہوا؟

3) چشم جاناں کی کیا کیفیت ہوئی؟

4) ''جو بلا آئی میرے گھر آئی'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5) کس وجہ سے ماہ و انجم شاعر کی نظر میں نہیں بچ سکے۔

غزل

بدرالحسن جمالؔی

نام	: بدرالحسن	تخلص	: جمالؔی

پیدائش : 17/جولائی 1926ء بمقام ویلور

اساتذہ	: مولانا کمالؔی ویلوری	شعری مجموعہ	: جمالیات

پیشہ : علم ریاضی کے ماہر استاد تھے۔سرکاری اسکول سے وظیفہ یاب ہوئے۔

بدرالحسن، بدر جمالؔی تملناڈو کے مایہ ناز اور ممتاز اساتذۂ شعروسخن میں سے ہیں۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی سے بی،یس،سی،بی،ٹی کرنے کے بعد مدرسۂ اعظم ہائر سکنڈری اسکول میں علم ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔آپ نے چونکہ 3 سال تک باقیات الصالحات میں تعلیم حاصل کی۔اسلئے اردو اور فارسی پر آپ کو خاصا عبور حاصل ہے۔مذہب کے علاوہ اُردو زبان کے ادب کا مطالعہ بہ غائر انداز سے کیا ہے۔مولانا کمالؔی ویلوری سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے۔آپ نے کئی مضامین بھی لکھے جو ''نفیر'' باقیات الصالحات کے جریدہ میں شائع ہو چکے ہیں۔''جمالیات'' آپ کا شعری مجموعہ ہے۔قوس قزح کے ست رنگ اُجالوں کی طرح

اس میں اپنے جذبات، احساسات کوفنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''جمالیات'' کے جمالیاتی رنگ میں روایات کے رنگ و جمال کی تجلّی پائی جاتی ہے۔ آپکو علمِ عروض پر خاصا درک حاصل ہے۔

قطرے میں دریا ذرّے میں صحرا دکھائی دے
وا دل کی آنکھ ہو تو تماشا دکھائی دے

تیری نظیر حُسن و ادا میں کوئی نہیں
مجھ کو بتادے کوئی جو تجھ سا دکھائی دے

اپنی برائیوں پہ اگر جائے گی نظر
دنیا میں ہر کوئی ہمیں اچھا دکھائی دے

چھانی ہے اس لئے رہ دیر و حرم کی خاک
شاید تمہارا نقشِ کفِ پا دکھائی دے

اپنی حیات عشق پہ ڈالیں اگر نظر
ناخوشگواریوں کا پلندا دکھائی دے

گُل کی ادا چمن میں جماؔلی ہے دلپذیر
سینہ ہو غم سے چاک تو ہنستا دکھائی دے

سوالات:

1) قطرے اور ذرّے میں شاعر کو کیا دکھائی دیتا ہے؟

2) شاعر نے محبوب کے حسن و ادا کی تعریف کن الفاظ میں کی ہے؟

3) دنیا میں ہر کوئی ہم کو کس طرح اچھا دکھائی دے گا؟

4) شاعر نے محبوب کے نقش کفِ پا کو پانے کے لئے کہاں کہاں کی خاک چھانی؟

5) شاعر کو اپنی حیاتِ عشق کیسی دکھائی دیتی ہے؟

6) ''سینہ ہو غم سے چاک تو ہنستا دکھائی دے'' کا کیا مطلب ہے؟

غزل

حامد الانصاری

نام : عبدالمجید حامد الانصاری پیدائش : 1926ء بمقام گڑیاتم

تخلص : حامد باقوی (گڑیاتمی)

تحصیل علم : باقیات سے مولوی کا کورس کیا، مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل

اردو کی خدمات: اُردو منشی کی حیثیت سے وظیفہ یاب ہوئے

اردو کے کئی شاعروں پر مقالے لکھے۔

حامد الانصاری باقوی کا شمار تمل ناڈو کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔اگر چہ کہ آپ نے غزل کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کیا اور شاعرانہ وفنکارانہ مہارت کے نمونے پیش کیے ہیں ۔لیکن ان کا اصلی جوہر نعت گوئی کی صنف سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے تقریباً چالیس سال تک گڑیاتم کے سرکاری اسکول میں اُردو منشی کی حیثیت سے اپنی خدمت انجام دی جس کے صلے میں حکومت تمل ناڈو نے آپ کو بہترین استاد ایوارڈ BEST TEACHER سے نوازا۔آپ کی علمی اور شعری خدمات سے انکار محال ہے۔

وہ ولولہ وہ شوق وہ انداز نہیں ہے
پہلو میں دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

ایک تیرے تصور کے سوا خلوت دل میں
ہم راز نہیں ہے کوئی دم ساز نہیں ہے

جب تک نہ ہو شعروں میں جھلک خون جگر کی
سب کچھ ہے مگر دل کی وہ آواز نہیں ہے

اُترے گا نہ سر سے کبھی یہ نشۂ اردو
مانا کہ یہ مئے بادۂ شیراز نہیں ہے

حامدؔ میں سخن گو ہوں سخن ساز نہیں ہوں
میرے لئے کچھ شاعری اعزاز نہیں ہے

سوالات:

1) شاعر کے پہلو میں دھڑکنے کی آواز کے علاوہ اور کیا نہیں ہے؟

2) شاعر کے خلوتِ دل کا ہم راز اور دل ساز کون ہے؟

3) شاعر نے شعروں میں دل کی آواز پیدا کرنے کے لئے کس چیز کی ضرورت کو اہم قرار دیا ہے؟

4) ''مانا کہ یہ مئے بادۂ شیراز نہیں ہے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5) شاعر نے مقطع میں شاعری کو اپنے لئے کیا چیز قرار دیا ہے؟

غزل

کاظمؔ نائطی

نام : کاظم حسین نائطی تخلص : کاظمؔ

والد کا نام : علامہ غضنفر حسین شاکرؔ نائطی

پیدائش : 14/ نومبر 1938ء تعلیم : یم، یس، سی، بی ایڈ

پیشہ : علم ریاضی کے ماہر استاد اے، ای، او کی حیثیت سے

ادبی خدمات: بہ یک وقت کئی اخبار اور رسائل کے قابل اور لائق مدیر معروف اور ممتاز ادیب محقق نقاد اور شاعر

تملناڈو کی ادبی و علمی آبرو اور عظیم الشان علمی، ادبی، شعری، فنی، مذہبی اور اخلاقی بزرگ ہستی علامہ شاکرؔ نائطی کے فرزند جلیل کاظمؔ نائطی ان چند خوش نصیب شعراء میں سے ایک ہیں جن کو بچپن ہی سے علمی، ادبی مذہبی اور اخلاقی ماحول ملا۔ بلا شبہ اردو، فارسی اور عربی کے شعر و سخن اور ادب کی دلکش اور دلگیر، آوازیں آپ کے گھر کے در و دیوار سے گونج رہی تھیں۔ ۔ مدراس یونیورسٹی سے آپ نے بی، ایس، سی، بی، ایڈ اور ایم، ایڈ، کیا۔ آپ نے اُردو زبان میں ایم، اے کی سند

حاصل کی، بہت سی علمی ادبی، فنی تنقیدی اور تحقیقی خوبیوں کے مالک ہیں۔آپ نے کئی وقیع مقالات اور افسانے اُردو کو دئے ہیں آپ ایک سلجھے ہوئے شاعر ہیں۔شاعری کے نشیب وفراز سے بھرپور واقفیت ہی نہیں رکھتے بلکہ ان پر قدرت بھی حاصل ہے۔

اردو زبان وادب کو آپ کے شعری اور ادبی مجموعہ کی طباعت کا بے صبری سے انتظار ہے۔

اپنے وہ سب کچھ تھے جو اپنے نہ تھے　　دل لگایا جن سے دل والے نہ تھے
آخری سانسوں نے شرمایا ہمیں　　اتنے سچّے ہم کبھی پہلے نہ تھے
نفرتوں نے ہی ادھیڑا ہے ہمیں　　چاہ کے دھاگے بہت کچّے نہ تھے
سارا عالم اُنؐ کا پرتو ہی تو ہے　　انؐ کے قدموں میں کبھی سائے نہ تھے
حادثوں میں کھیلنے والے تھے ہم　　تجربوں کی گود میں بیٹھے نہ تھے
میری سوچیں اور موجیں ایک سی　　تیز گھوڑے تھے کہیں رُکتے نہ تھے
گھر میں اپنے بوریا اک رکھ لیا　　عیش کی چیزیں کبھی رکھتے نہ تھے
بے مزہ باتیں کبھی کرتے نہیں
کاظم اپنے فن میں ہم پھیکے نہ تھے

سوالات:

1) شاعر کسے ''اپنے'' اور کسے ''دل والے'' قرار دیتا ہے؟

2) آخری سانسوں نے شاعر کو کیوں شرمایا؟

3) شاعر نے نفرت اور چاہ کے دھاگوں میں کیا فرق بتایا ہے؟

4) حادثوں اور تجربوں میں شاعر کو کیا اور کیسا محسوس ہوتا ہے؟

5) شاعر نے اپنے گھر میں بوریا رکھ لیا، کیوں؟

6) شاعر نے مقطع میں اپنے فن کے تعلق سے کیا کہا ہے؟

غزل

کاوش بدری

کاوش بدری تمل ناڈو کے ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کا نام وی۔ پی۔ عبدالرزاق پاشاہ اور قلمی نام کاوش بدری ہے۔ ۳، فروری 1928ء کو ضلع شمالی آرکاٹ کے ایک مردم خیز شہر آمبور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بی۔ اے۔ مدراس یونیورسٹی سے کیا۔ افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق، مولانا محمد یوسف کوکن، مولانا رحیم احمد فاروقی، مولانا ابوالجلال ندوی، مولانا شاکر نائطی وغیرہ سے علمی فیوض حاصل کیے۔ تمل آپ کی مادری زبان ہے اور اردو اکتسابی زبان۔ ان کی تصانیف میں ''مثنوی قبلہ نما'' ''شردھانجلی'' ''کاویم'' اور ''قطب مدراس'' قابل ذکر ہیں۔ آپ کو بہار اردو اکاڈمی نے 1981ء میں اور آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنو نے 1993ء میں ادبی انعامات عطا کیے۔

عجیب شخص ہے دن رات گھر میں رہتا ہے
مگر خضر سے زیادہ سفر میں رہتا ہے

شروع سے ہی تعلق رہا ہے اس سے مرا
جہاں بھی گم ہو وہ میری نظر میں رہتا ہے

وہ شعلگی ابھی شاعر کی نبض میں کم ہے
جو شعلہ سا نفسِ نغمہ گر میں رہتا ہے

لہو کہیں بھی اکارت نہیں گیا اپنا!!
ترے ہی سنگ ترے سنگِ در میں رہتا ہے

ضرور صحبتِ بیمار کا نتیجہ ہے......!
بلا کا نور چراغِ سحر میں رہتا ہے!

جو بھول ہوگئی مجھ سے وہ پھول ہے گویا
کوئی تو عیب کسی کے ہنر میں رہتا ہے!

زمانہ جس کی ملاقات کو ترس جائے
وہ بدنصیب تری رہ گذر میں رہتا ہے

دکن کی آگ میں جلتا تو خوب تھا کاوشؔ
یہ کورچشم تو چوپٹ نگر میں رہتا ہے!

ات:

گھر میں رہتے ہوئے سفر میں رہنے کا کیا مطلب ہے؟

شاعر، شاعری میں کس شعلہ کی بات کر رہا ہے؟

شاعر نے ''بھول'' کو ''پھول'' کیوں کہا ہے؟

زمانہ کس کی ملاقات کے لئے ترس جاتا ہے؟

دکن کی آگ سے کاوشؔ کی کیا مراد ہے؟

غزل

علیم صبا نویدی

نام	: سیّد علیم الدین حسینی	تخلص	: صبا نویدی

پیدائش : 28/فروری 1942ء بمقام امور (شمالی ارکاٹ)

تعلیم : بی. اے. (علیگ)

والد کا نام : سیّد غوث پاشا حسینی

اساتذہ : پہلے حضرت راجی صدیقی پھر حضرت دانش فرازی کے شاگرد ہوئے

مجموعۂ کلام: کئی شعری مجموعے ہیں۔

علیم صبا نویدی ٹملناڈو کے عظیم محقق، نقاد، ممتاز شاعر، ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ اگر آپ کو علمی، ادبی، تحقیقی، صحافتی اور شعری خدمات کی بدولت اُردو زبان وادب کی آبرو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ علیم اُردو زبان وادب کی تاریخ وجغرافیہ پر چھائے ہوئے ہیں۔ آپ کو اپنی علمی، ادبی اور تحقیقی شہ پاروں پر بے حد ناز ہے۔

آپ نے اُردو شاعری کی تمام تر اصناف پر قلم اٹھایا ہے اور کامیاب تجربے کئے ہیں۔ آپ کے شعری اور ادبی کارنامے وقیع اور قابل قدر کتابوں کی صورت میں منظر عام پر آچکے ہیں۔

لمحہ لمحہ مرے احساس کا قاتل نکلا
مرا چپ رہنا بھی ماحول میں مشکل نکلا

آسماں توڑ کے سر اپنا اٹھایا تھا مگر
آسماں اور بھی اک میرے مقابل نکلا

لاکھ دیوار کی باہوں نے اُسے روکا تھا
بند کمرے کا تماشا سرِ محفل نکلا

عافیت ڈھونڈ کہیں گوشۂ گمنامی میں
تیرا شہرہ ہی تری موت کی منزل نکلا

مرے ادراک کی لہروں میں جنم لیتا جمال
ہر نئے رنگ کی آواز میں شامل نکلا

فتنہ یہ خانہ خرابی کیلئے کیا کم ہے؟
لوگ کہتے ہیں صباؔ جوہرِ قابل نکلا!

سوالات:

1) شاعر کا چپ رہنا ماحول کیلئے کیسا نکلا؟

2) شاعر آسماں توڑ کر اپنا سر اُٹھایا تو کیا ہوا؟

3) شاعر کیوں گوشۂ گمنامی میں عافیت تلاش کرنا چاہتا ہے؟

4) شاعر کے ادراک کی لہروں میں کون سی چیز جنم لیتی ہے؟

5) ''فتنہ یہ خانہ خرابی کیلئے کیا کم ہے''۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

غزل

حسن فیاض

حسن فیاض تملناڈو کے ایک ممتاز سلجھے ہوئے شاعر ہیں۔ کلام میں فلسفیانہ رنگ و آہنگ اور منطقی انداز ملتا ہے۔ آپ کے موضوعات میں عمق اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے خاص اسلوب سے پہچانے جاتے ہیں۔ کلام میں شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ آپ کے چہرہ پر چھائی ہوئی متانت اور سنجیدگی کی گہری چھاپ آپ کے افسانوں اور ادبی وتنقیدی مضامین میں بھی نظر آتی ہے۔

ہوائیں تیز تھیں جلتا رہا دیا پھر بھی
اندھیری رات میں باقی رہی ضیا پھر بھی

کرم کے ساتھ غضب بھی ہے حق کی جانب سے
مرے گناہوں کا جاری ہے سلسلہ پھر بھی

قفس میں راحتیں کیا کم تھیں مرغ جاں کیلئے
ہوئی نہ اس کو تشفی کہ اڑگیا پھر بھی

قدم قدم پہ مصیبت ہے دکھ ہے آفت ہے
عجیب بات ہے جینے میں ہے مزا پھر بھی

ادا کے ناز کے چھپ کے بچھائے حُسن نے دام
بچایا دل کو مگر ہاتھ سے گیا پھر بھی

ہرا چکی ہے ہرائے گی زندگی پیہم
حُسن کا دیکھئے قائم ہے حوصلہ پھر بھی

سوالات:

1) ہوا تیز رہنے اور اندھیری رات کے باوجود کیا روشنی برقرار تھی؟
2) شاعر اپنے گناہوں کے جاری سلسلہ کو کیسے ثابت کرتا ہے؟
3) قفس سے مرغ جاں کے اُڑنے کا سبب شاعر نے کس بات کو بتایا ہے؟
4) قدم قدم پہ مصیبت دکھ اور آفت کے باوجود اسے جینے کا احساس کیسا لگتا ہے؟
5) بچانے کے باوجود شاعر کا دل ہاتھ سے کیسے نکل گیا؟
6) زندگی شاعر کو پیہم ہرا چکی ہے بلکہ ہرائے گی بھی لیکن اس کے باوجود کس کی بدولت اس کا بھرم قائم ہے؟

غزل

جلاؔل مدنی

جلاؔل مدنی یکم جولائی 1931ء کو دھاراپورم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ ایک علمی گھرانا تھا۔ شعری ذوق آپ نے ورثہ میں پایا تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ آڈیٹر تھے۔ سیلم جیسے غیر ادبی ماحول میں جلاؔل نے شعر و سخن کی شمع روشن رکھی یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ کی شاعری میں آپ کی شخصیت جلوہ نما ہے، شاعری کا مجموعہ ''افکار جلال مدنی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ 17، جون 1999ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

مرے اشک کس نے دیکھے، مرا درد کس نے جانا
مجھے فطرتاً ملا ہے، شب غم میں مسکرانا

ترا روپ پر کشش ہے، ترا حسن منفرد ہے
تجھے جس جگہ بھی دیکھا، وہیں رک گیا زمانہ

نہیں خود بُرا زمانہ، ہے بُرا کوئی تو انساں
یہ سنبھل گیا تو سمجھو، کہ سنور گیا زمانہ

سبھی بچ کے چل رہے ہیں، نہیں کوئی میرا ساتھی
مرا حال خوش تھا جب تک مرے ساتھ تھا زمانہ

گرا جا رہا ہوں جب سے مرا دل یہ کہہ رہا ہے
کہ قریب آچکا ہے ترا سنگ آستانا

رہِ زیست میں ہوا ہے جلاؔل اک عجب تماشا
کبھی چوٹ کھا کے گرنا، کبھی گر کے چوٹ کھانا

سوالات:

1) درد چھپانے کی کیا کیفیت جلال مدنی نے بیان کی ہے؟
2) محبوب کے حُسن کا اثر زمانے پر کیا ہوا؟
3) انسان کی خرابی زمانے کی خرابی کیوں کر بنتی ہے؟
4) زمانے کے ساتھ نہ چلنے میں کیا خرابی ہے؟
5) زندگی میں جلاؔل کے ساتھ کیا تماشا ہوا؟

غزل

حسرتؔ سہروردی

حسرتؔ سہروردی 1930ء میں شہر ترچی میں پیدا ہوئے۔ طویل عرصے تک جمال محمد کالج ترچی کے شعبہ اردو میں تدریسی خدمت انجام دی۔ آپ نے تمل زبان کی شہرۂ آفاق کتاب ''ترو کرل'' کا اردو زبان میں منثور ترجمہ کیا۔ اس کتاب پر انھیں 1970ء میں ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ بھی ملا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت ساری تمل کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان میں ''تامل افسانے'' کافی مقبول ہوئی۔ حسرتؔ کہنہ مشق شاعر تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام ''بوئے گل نالۂ دل'' شائع ہو چکا ہے۔ جس پر اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے انھیں انعام بھی ملا۔ 73/برس کی عمر میں جولائی 2003 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کون ہوں کیا ہوں کس جگہ ہوں میں — اک معمہ ہوں لاپتہ ہوں میں
ٹیڑھے میڑھے ہیں راستے پھر بھی — سمت منزل کے جا رہا ہوں میں
کوئی آگے نہ ہے کوئی پیچھے — بندگی میں بھی اک خدا ہوں میں
اُس طرف دیر اِس طرف کعبہ — بیچ رستے میں کھو گیا ہوں میں
کس کو الزام بے وفائی دیں — خود پہ الزام دھر رہا ہوں میں
نور کا اک اتھاہ ساگر ہوں — آئینہ گر ہوں آئینہ ہوں میں
حادثے مجھ کو راس آئے ہیں — اصل میں خود بھی حادثہ ہوں میں
میرے زد میں ہیں آج شمس و قمر — کس بلندی پر آ گیا ہوں میں
تیری محفل سے اُٹھ گیا ہوں مگر — تجھ کو آنکھوں میں لے چلا ہوں میں
تیری تصویر بھی ہے تو بھی ہے — کس کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں

دل کے رشتے عجیب ہیں حسرتؔ
یاد آئے تو رو پڑا ہوں میں

سوالات:

1) شاعر اپنے آپ کو ایک معمہ کیوں بتا رہا ہے؟

2) ''دیر'' اور ''کعبہ'' کے بیچ کھو جانے کا کیا مطلب ہے؟

3) شاعر نے خود کو آئینہ سے کیوں تشبیہ دی ہے؟

4) شمس و قمر شاعر کی زد میں کیوں ہیں؟

5) دل کے رشتے عجیب کیوں ہوتے ہیں؟

تعصب

سرسید

آپ کی پیدائش 1817ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وتربیت ان کی والدہ کے زیر سرپرستی ہوئی۔ 1837ء میں سرسید نے ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صدر امین کے درجہ تک پہنچ گئے۔

اردو ادب میں سرسید وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر میں تاریخی تخلیقی مذہبی اور تعلیمی مسائل کو اٹھایا۔ ان کی عبارت صاف ستھری اور رواں ہوتی ہے۔ بے ساختگی، متانت اور ظرافت اُن کی تحریروں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ آپ کے اردو نثر پر بہت سے احسانات ہیں انہوں نے اردو نثر کو تکلفات سے نکال کر آزاد کیا اور زبان کو سلیس اور آسان بنایا۔

سرسید احمد خان ایک زبردست مصنف، بلند خیال مفکر و مدبر اور مخلص قومی مصلح تھے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے۔ 1898ء میں سرسید نے طویل عمر پا کر انتقال کیا۔ اپنے محبوب کالج کی مسجد میں دفن کئے گئے۔

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیوں کہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیوں کہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب، انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصب کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے۔ مگر اوّل امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند

لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قواعد فطرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدّن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزّت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے مگر متعصب ان سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہئے مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہے۔ اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا عقل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجۂ مذلّت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔

بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تیئں ایک معزز قوم کو دکھانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لئے میری خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم وفضل اور ہنر وکمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ بڑی ہے کہ بعضی دفعہ ایک غلط نما نیکی کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں اور تمام ان علوم اور فنون کو جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور برا سمجھے۔ اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں۔

پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کر ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیوں کہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو

ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کو ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہو گی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لئے ہو سکتی ہے اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی نیکیوں اور خوبیوں کو پھیلاتا ہے۔ اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معترضوں اور برا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اس کے دفعیہ پر متحد ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اسکے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پہلی بسم اللہ ایسی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا ہارج قوی ہوتا ہے۔ اپنے تعصب کے سبب بداخلاق اور مغرور اور متقشف سخت دل ہوتا ہے اور ٹھیک اس آیتِ کریمہ ﴿لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ سے مخالفت صریح

کرتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسرے کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس سبب سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کئے اور بلا جواب دیئے باقی رہ جائیں۔ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے پس یہ تمام باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں ہیں بلکہ مخالفوں کی فتح یابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرض کہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں نہایت برا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور و متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اس کے اصول کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا اور بہ مجبوری ہر ایک سے ملتا ہے اور اوپری دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرنے سے ایک اور بدخصلت نفاق اور کذب اور دغابازی اور فریب و مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہے مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔

علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی ۔ ہنر وفن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی ۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے ۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے حصول معاش اور دنیاوی عزت وتموّل مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے ۔

اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس اور کیا کر رہے ہیں ۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے ۔ بیا کیا بن رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے ۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے ، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے ۔ تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر وکمال اس میں نہیں آتا ، تربیت وشائستگی ، تہذیب وانسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نما نیکی کے پردہ میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہوتا ہے کیوں کہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔ انسان کے خراب وبرباد کرنے کیلئے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر کر دکھلانا ہے ۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچا سچائی کا پسند کرنے والا ہے ۔ وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا

ہے۔ وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہیئے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے پس اس کی ہم کو پیروی چاہیئے۔

سوالات: حصّہ (الف)

1) متعصب شخص کی پہچان کیا ہے؟

2) تعصب کی برائیاں بیان کیجئے؟

3) متعصب شخص اور عام انسان میں کیا فرق ہے؟

4) متعصب شخص کن کن نعمتوں سے محروم رہتا ہے؟

5) بعض قومیں کس طرح اعلیٰ درجہ کو پہنچ گئی ہیں؟

6) کسی مذہب کو نقصان پہنچانے والی بات کونسی ہے؟

7) غیر متعصب کی خوبیاں بیان کیجئے؟

8) تعصب کا سب سے بڑا نقصان کیا ہے؟

9) سرسید کی نظر میں ہمارا قدرتی فرض کیا ہے؟

10) ان الفاظ کے معنی لکھئے اور انہیں جملوں میں استعمال کیجئے:

تعصب، خصائل، متنبہ، مدنی الطبع، معاون،

امور، منفعت، جاہ وحشمت، مشتبہ، معزز، معترض

حصہ (ب) تفصیلی سوالات:

1) ایک خود غرض اور ایک متعصب کی فطرت ایک ہے! مدلل بیان کیجئے۔

2) مذہب میں تعصب کا عنصر کس قدر خطرناک ہے سرسید کے حوالے سے لکھئے۔

3) ''تعصب بری بلا ہے انسان کی تمام نیکیوں کو برباد کردیتی ہے''

اس قول کی وضاحت کیجئے۔

حصہ (ج) بحوالۂ متن لکھئے۔

1) ''متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا''

2) ''تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے''

3) ''ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دیناوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں''

4) ''ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہیئے''

زبانِ گویا

مولانا الطاف حسین حالؔی

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالؔی 1837ء میں پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ سلسلہء نسب آپ کا حضرت عبداللہ انصاری سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم پانی پت میں حاصل کرنے کے بعد دلّی آئے۔ جہاں درسیات سے فراغت حاصل کی۔ ان ہی دنوں وہ مرزا غالبؔ کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ مولانا حالؔی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے اور آٹھ سال تک ان کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ اس کے بعد لاہور گورنمنٹ بُک ڈپو میں ترجمہ کے کام پر مامور ہوئے۔ جہاں جدید اُردو کے پیشرو مولانا محمد حسین آزادؔ سے ان کی ملاقات ہوئی اور انکے دل میں بھی اُردو زبان وادب کی اصلاح اور ترقی کا خیال پیدا ہوا سر سید احمد خاں سے ملاقات کے بعد مولانا حالؔی مسلمانوں کے قومی شاعر ہو گئے۔ ان کی کتاب مسدّس حالی کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1904ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور 1914ء میں اپنے وطن میں انتقال کیا۔

مولانا حالیؔ ایک کامیاب شاعر اور اعلیٰ پایہ کے نثار تھے۔ غالبؔ اور سرسیّد کے طرز تحریر کو زندہ رکھنے میں ان کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ مولانا کی تحریر صاف، سادہ، بامحاورہ اور موثر ہوتی ہے۔ ان کی نثر پر پیامی رنگ غالب ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سلجھا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے، نثر میں یادگار غالبؔ، حیاتؔ جاوید، حیاتؔ سعدی، اور مقدمہ شعروشاعری آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ کے مضامین کا مجموعہ انجمن ترقّی اُردو نے مقالات حالیؔ کے نام سے شائع کیا تھا۔ ذیل کا مضمون مقالات حالیؔ سے ماخوذ ہے اس میں مولانا نے زبان کی قوت اور اُس کے مختلف نتائج سے بحث کی ہے۔ انداز بیان میں سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ موسیقی اور ترنّم ہے۔

اے میری بلبل ہزار داستان ! اے میری طوطی شیوہ بیان !

اے میری قاصد ! اے میری ترجمان ! اے میری وکیل ! اے میری زبان ! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جُدا اور تیرے ہر پھل میں نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا نہ جادو نہ اُتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جسکے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لُبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے جو جوانی میں کبھی اپنی نرمی

سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینہ کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا! اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزّت، ہماری ذلّت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا جھوٹ، ہمارا سچ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس ''ہاں'' اور ''نہیں'' نے کروڑوں کی جانیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر طاقت تیری نمونہ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا، تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل

اس کا خزانچی، حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی، دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے، اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چُرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ اُمید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے، تہمت بھی لگائے، فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسرے کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے نکال کر کھینچ لی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے انھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے اُنھیں فریبی اور مکاّر کہا۔ کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز کسی نے بدعہد بنایا اور کسی نے غماز، غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکالے اور وہ سب کے سب سزاوار ٹھہرے۔

اے زبان! یاد رکھ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں

گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا اور کتا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں ''نہیں'' اور زبان پر ''ہاں''

الٰہی! اگر ہم کو رحمت گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے۔ اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔

سوالات: حصہ (الف)

1) حالی نے زبان کو کن ناموں سے پکارا ہے؟
2) دشمن کو دوست بنانے اور دوست کو دشمن کر دکھانے کا کھیل زبان کیوں کر کرتی ہے؟
3) ''اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسرے کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدّی سے نکال کر کھینچ لی جائے گا۔ حالی نے ایسا کیوں کہا ہے؟
4) حالی زبان کے کہنے میں اور اسکے قابو میں کیوں نہیں آنا چاہتے ہیں؟
5) مضمون کے آخر میں حالی خدا سے کیا دعا مانگتے ہیں؟

6) ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے:

1) ساحر　2) افعی　3) حنظل

4) رائگاں　5) ایلچی　6) ناصح

7) مشفق　8) غمّاز　9) مکار

10) مطلق العنان

حصّہ (ب): بحوالۂ متن تشریح کیجیے:

1) کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا نہ جادو نہ اتار کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر

2) روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟

3) راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا [illegible] زیور کو زنگ نہ لگا۔

حصّہ (ج) ذیل کے سوالات کے جوابات تفصیل سے لکھیے۔

1) ''زبان گویا'' میں حالی نے زبان کی کون کون سی خوبیاں اور خامیاں بتائی ہیں۔

2) ''زبان گویا'' کا خلاصہ لکھیے۔

نور جہاں

محمد حسین آزاد

اردو ادب کے جو عناصر خمسہ کہلاتے ہیں ان میں محمد حسین آزاد بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ محمد حسین نام اور آزاد تخلص تھا۔ ان کے والد اپنے زمانے کے ایک بے باک صحافی تھے۔ آزاد دہلی کے رہنے والے تھے سنہ ولادت 1832ء ہے۔ جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے بیٹے کو ذوق کے سپرد کیا جن کے سایہ عاطفت میں آزاد کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ آزاد کے کارنامے اردو ادب میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں انہوں نے اردو شاعری میں نظم نگاری کی داغ بیل ڈالی اور اردو نثر میں بھی ایسی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جو اس سے پہلے نظر نہ آتی تھیں۔

''آب حیات'' اردو کا ایک بے مثال تذکرہ ہے اور علم اللسان پر ''سخندان فارس'' ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ آزاد کا انتقال 1910ء میں ہوا۔ ان کا طرز تحریر بڑا دلکش اور زبان کی شیرینی، سادگی اور بے تکلفی ان کی تحریر کے خاص جوہر ہیں مہدی افادی نے انہیں اردوئے معلیٰ کا ہیرو تسلیم کیا ہے۔

ملک ایران میں خواجہ محمد شریف ایک عہدہ دار بادشاہ ہی تھا۔ چونکہ آدمی بالیاقت اور صاحب تدبیر تھا۔ بڑھتے بڑھتے بادشاہ کے دربار میں وزارت کے مرتبہ کو پہنچ گیا۔ چند روز بعد اس کا انتقال ہوا۔ مگر وارثوں سے فلک نے دغا کی۔ مرزا غیاث الدین اس کا بیٹا ایسا تباہ ہوا کہ معاش کی تلاش میں گھر سے نکلا اور ایک قافلے کے پیچھے پیچھے مع عیال ہندوستان کو روانہ ہوا۔ بی بی حاملہ تھی۔ اسی حالت میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بے سروسامانی کا سفر، جنگل کا مقام محلوں کے بیٹھنے والے ماں باپ نے ساری رات جنگل میں روتے روتے کاٹی، صبح ہوئے پھر روانہ ہوئے۔ مگر لڑکی جو ایسے نحوست کے وقت میں پیدا ہوئی تھی اس کا لے چلنا سخت مشکل ہوا۔ آخر اس نے اپنی حالت اور بیٹی کے انجام کو سوچا، کہا کہ خدا پر توکّل کرو اور اس کی قسمت کے حوالے کر کے یہیں چھوڑ دو۔ ہر چند آتما کی آگ گود سے اتارنے نہ دیتی تھی مگر کچھ بن نہ آئی تو ماں نے بھی کلیجے کے ٹکڑے کو زمین پر رکھ دیا۔ اور روتی چلی گئی، ایک رات کی جان جنگل میں پڑی روتی تھی۔ تھک جاتی تو ہاتھ چوسنے لگتی تھی مگر قسمت سرہانے کھڑی ہنستی تھی کہ جلدی نہ کر جس محل میں تجھے ملکہ بنا کر بٹھانا ہے۔ وہ ابھی تعمیر نہیں ہوا۔ پیچھے پیچھے ایک قافلہ بھی آتا تھا۔ اس صبح کے تارے کو زمین پر پڑا دیکھ کر سب حیران ہو گئے۔ سوداگر کے دل میں خدا نے ڈالا گود میں لیے منزل پر آیا، اس جنگل بیابان میں دودھ کہاں، سارے قافلے میں اس بات کا چرچا تھا۔ کسی کو مرزا غیاث کا بھی خیال آیا۔ سوداگر سے کہا کہ وہ فلک زدہ جو قافلہ کے ہمراہ ہے، اس کے

چھوڑ دیا۔ بلکہ رفتہ رفتہ یہ شکایت بادشاہ کے کان تک پہنچی۔ اکبر بہت خفا ہوا بیٹے کو خلوت میں بلا کر سمجھایا۔ ساتھ ہی اس نے مرزا غیاث کی بیوی سے کہا کہ تم اپنی بیٹی کی کہیں شادی کر دو۔ اور چند روز اسے جہانگیر کی آنکھوں سے الگ رکھو۔ علی قلی خاں ایک شخص شاہ ایران کے نعمت خانے کا داروغہ تھا۔ وہ بادشاہ کے مرنے کے بعد انقلاب سلطنت سے ملتان میں آنکلا عبدالرحیم خانِ خاناں ان دنوں بھکر میں لڑتا تھا۔ اس سے ملاقات ہوئی اور معرکے میں بڑی بڑی جانبازیاں کیں۔ جب خانِ خاناں دربار میں آیا تو اسے بھی دربار میں حاضر کیا۔ علی قلی خاں جیسا لئیق، بہادر تھا، ویسا ہی صورت کا وجیہہ تھا۔ اکبر نے ایک معزز عہدہ دے کر اس سے مہر النساء کی شادی کر دی اور ڈھاکے کا صوبہ دار کر کے بھیجدیا۔ مہر النساء حسن وخوبی کے ساتھ عقل کی پتلی اور لطائف وظرافت میں بلبل ہزار داستان تھی۔ چند روز میں میاں کو غلام بنالیا۔ علی قلی خاں کو فن رمل میں بھی دخل تھا۔ ایک دن زائچہ دیکھ رہا تھا۔ بیگم نے کہا ذرا میرا بھی زائچہ تو دیکھو۔ اس نے قرعہ پھینکا اور دیکھ کر کہا کہ بیگم سر پر چتر شاہی قربان ہوتا نظر آتا ہے۔ بیگم ہنسنے لگی مگر ساتھ ہی جہانگیر کا معاملہ دل میں کھٹک گیا۔ الغرض جب جہانگیر باشاہ ہوا تو پھر اُس کی نیت برگشتہ ہوئی۔ علی قلی خاں کو بہانے سے بلا بھیجا۔ اور چاہا کہ کسی ایسے ڈھب سے مروا ڈالے کہ جس کا الزام اس پر نہ آئے۔ چنانچہ ایک دن اس کی شجاعت اور بہادری کی بہت سی تعریف کر کے مست ہاتھی کے سامنے کر دیا۔ اس شیر جنگ نے اسے مار ہٹایا۔ پھر ایک شیر سے نہتا بھڑا دیا۔ اس نے اسے بھی بے ہتھیار مارا اور شیر افگن خطاب لیا۔ جب یہ وار نہ چلا تو

ایک رازدار کی زبانی صاف پیغام بھیجا۔ اس غیرت والے کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور سوچ سمجھ کر یہی مناسب دیکھا کہ اس نوکری پر لعنت کر کے اپنی جاگیر پر جا بیٹھے۔ بادشاہ نے قطب الدین خاں کو وہاں کا صوبہ دار کر کے بھیجا اور اشارہ کر دیا کہ جس طرح ہو اس کا کام تمام کر دے۔ شیر افگن بے خبر بردوان میں اپنی جاگیر پر بیٹھا تھا۔ سنتے ہی استقبال کو آیا۔ دو چار جاں نثار اس کے ہمراہ تھے۔ قطب الدین کے آدمیوں نے انھیں فوراً گرفتار کر لیا۔ شیر افگن خاں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا۔ تلوار گھسیٹ کر کوکا جی کے ایک ایسا ہاتھ مارا کہ دو ٹکڑے ہو کر ہزار سالہ مردوں میں جا ملے۔ بادشاہی سپاہی دیکھتے ہی ٹوٹ پڑے اور اس تن تنہا کی بوٹی بوٹی بانٹ لی۔ سب گھر بار لوٹ کر دربار روانہ ہوئے مگر مقصد اسی گوہر شب چراغ سے تھا۔ چنانچہ اب تو پردہ بھی درمیان سے اٹھ گیا تھا۔ ایک بی بی کھلم کھلا پیغام لے کر آئیں۔ مہر النساء سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی۔ ''شیر افگن جیسے خاوند کو گنوا کر دوسرے کا منھ دیکھنا ننگِ وفا کا منہ کالا کرنا ہے۔ بی بی تم میری طرف سے حضور میں عرض کرو کہ خیر جہاں پناہ، اس بدنصیب پر جو کچھ گزر گئی اس کی تقدیر ہی میں لکھا تھا مگر بیوہ بے کس پر اب رحم فرمائیں مگر جہانگیر اس روکھے پن سے بہت اچاٹ ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ماں کو اشارہ کیا کہ مہر النساء کو اپنے مصاحبوں میں رکھ لو۔ مدت اس طرح بھی گذری۔ غرض آخر کو یہ ہوا کہ مہر النساء سے نور محل اور نور محل سے نور جہاں بادشاہ بیگم بن کر نور الدین جہانگیر کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

I سوالات

1) خواجہ محمد شریف کون تھا اور وہ کس مرتبہ کو پہنچا؟

2) مرزا غیاث الدین تباہ ہو کر کس کی تلاش میں نکلا اور کہاں روانہ ہوا؟

3) مرزا غیاث الدین کی لڑکی کس حالت میں کہاں پیدا ہوئی اور ماں باپ نے اُسے کہاں چھوڑا؟

4) سوداگر نے لڑکی کو کس کے حوالے کیا؟

5) مرزا غیاث الدین اور اُسکی بیگم کس کے محل میں رہنے لگے۔

6) مہر النساء کی کونسی ادا شہزادہ جہانگیر کو زیادہ بھا گئی؟

7) اکبر کس بات سے خفا ہوا اور اُس نے مرزا غیاث کی بیوی کو کیا مشورہ دیا؟

8) علی قلی خاں کون تھا، اکبر نے اُسے کس عہدے سے سرفراز کیا تھا؟

9) علی قلی خان کو شیر افگن کا خطاب کسطرح حاصل ہوا؟

10) جہانگیر نے علی قلی خاں کا خاتمہ کسطرح کیا؟

11) علی قلی خان کی موت کے بعد مہر النساء، نور جہاں بادشاہ بیگم بن کر جہانگیر کے پہلو میں کس طرح بیٹھی؟

II بحوالۂ متن تشریح کیجیے۔

1) لڑکی جو ایسے نحوست کے وقت پیدا ہوئی تھی اس کا لے چلنا سخت مشکل ہوا۔
آخر اس نے اپنی حالت اور بیٹی کے انجام کو سوچا۔ کہا کہ خدا پر توکل کرو اور
اس کی قسمت کے حوالے کر کے یہیں چھوڑ دو۔

2) وہ فلک زدہ جو قافلہ کے ہمراہ ہے اس کے عیال بھی ساتھ ہیں اگر سپرد کرو تو
عجب نہیں کہ اس بچی کی جان بچ جائے۔

3) باپ کے حقوق کو سفارش میں پیش کیا اور چونکہ خود بھی محاسب، خوش نویس
اور شاعرِ خوش تقریر تھا۔ دیوانِ بیوتات ہو گیا۔

4) جب شہزادہ اس طرف متوجہ ہوا، کہا ''ہیں میرا کبوتر کیا ہوا''، اس نے کہا
''صاحب عالم وہ تو اڑ گیا'' ''شاہزادے نے کہا۔'' ''کیونکر'' اس نے دوسرا
بھی اڑا دیا کہ اس طرح اڑ گیا۔

5) ذرا میرا بھی زائچہ تو دیکھو، اس نے قرعہ پھینکا اور دیکھ کر کہا کہ بیگم سر پر
چتر شاہی قربان ہوتا نظر آتا ہے۔

III ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے

معاش :	مع عیال :	بے سروسامانی :
سوداگر :	محاسب :	البیلا پن :
خلوت :	زائچہ :	چتر شاہی :
برگشتہ وار :	شیر افگن :	ننگِ وفا :

IV تفصیلی جواب لکھیے

1) مرزا غیاث الدین کو قسمت کہاں سے کہاں لے آئی، تفصیل کے ساتھ لکھیے۔

2) مہر النساء سے نور جہاں بادشاہ بیگم بننے تک کیا کیا واقعات پیش آئے۔

دستگیری

ڈپٹی نذیر احمد

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب 1831ء میں راہر ضلع بجنور کے ایک ذی علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا جن سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر سے پڑھی۔ 1845ء میں دلی چلے آئے اور مولوی عبدالخالق سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ بعد میں ان ہی کی پوتی سے آپ کی شادی ہوئی۔ مولانا نذیر احمد صاحب مولوی مملوک علی صاحب پروفیسر عربی کی ترغیب سے اورنٹیل کالج میں داخل ہوئے۔ جہاں انھوں نے آزاد اور مولانا ذکاءاللہ کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی۔

اختتام تعلیم کے بعد 25 روپیہ ماہوار پر پنجاب میں مدرّس مقرر ہوئے۔ لیکن فوراً ڈپٹی انسپکٹر مدارس بنادیے گئے۔ 1861ء میں قانون تعزیرات ہند کے اُردو ترجمہ سے اُن کی شہرت ہوئی اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اخیر میں سر سالار جنگ نے ان کی خدمات حیدرآباد تبدیل کرالیں جہاں سترّہ سو روپیہ ماہوار پر بورڈ آف ریونیو کے

اعلیٰ عہدہ تک ترقی کی۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں آپ نے قرآن شریف بھی حفظ کیا۔ 1897ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ 1902ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل، ایل، ڈی کی اعزازی ڈگری اور 1902ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری دی 1912ء میں دلّی میں انتقال کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنی تصنیف وتالیف کی بدولت بڑا اعزاز اور بڑی شہرت حاصل کی۔ قانونی کتابوں کے ترجمہ کی بدولت حکومت میں قرآن پاک کے ترجمہ اور اپنی دوسری مذہبی تصانیف کی وجہ سے مسلمانوں میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ توبتہ النصوح، ابن الوقت، مراۃ العروس، بنات النعش۔ رویائے صادقہ، ایامیٰ اور محصنات آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے اُردو میں اخلاقی ناول لکھے اور کہانیوں سے غیر فطری عناصر کو نکال دیا۔

ڈپٹی صاحب کی تحریر کی خصوصیت سادگی اور بے تکلفی ہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ استعمال کرجاتے ہیں جس سے عبارت کی روانی کم ہوتی جاتی ہے۔ ان کی طرز نگارش میں ہلکی سی ظرافت بھی ملتی ہے، وہ سلیس اور بامحاورہ اُردو لکھتے ہیں۔

ذیل کا مضمون نذیر احمد کے اخلاقی ناول 'توبۃ النصوح'' سے ماخوذ ہے۔

جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح عین مصیبت کے وقت علیم نے ایک غریب خاں صاحب کی مدد کر کے ان کی عزّت بچائی۔ اور اس کی اس ہمدردی کو ماں باپ نے کتنا سراہا۔

ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھ کو اماں جان نے بنا دی تھی۔ وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے خالہ جان کے یہاں جاتا تھا میاں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپراسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی جمع تھے یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں جا گھسا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت غریب بوڑھی عورت ہے۔ چھوٹے کئی بچّے ہیں۔ سرکاری پیادے اس کے میاں کو پکڑے لئے جا رہے ہیں۔ اس واسطے کہ اُس نے کسی بنئے کے یہاں سے اُدھار کھایا تھا۔ اور بنئے نے اس پر ڈگری جاری کرائی تھی۔ وہ مرد کہتا تھا کہ قرضہ واجب ہے۔ مگر میں کیا کروں اس وقت بالکل تہی دست ہوں۔ ہر چند اس بیچارے نے بنئے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری خوشامد کی مگر نہ بنیا مانتا تھا نہ پیادے باز آتے تھے۔ اور پکڑے لئے چلے جاتے تھے۔ لوگ جو وہاں کھڑے تھے انھوں نے بھی کہا۔ لالہ جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ۔ بنیا بولا۔ میاں جی، اچھی کہی، برسوں کا ناداں اور روج ٹال مٹول، بھگوان جانے ابھی تو کھاں صاحب کی اِجّت اُتروائے لیتا ہوں۔ وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی غریب تو تھا لیکن غیرت مند بھی تھا۔ بنئے نے جو عزت اُتروانے کا نام لیا۔ سُرخ ہو گیا اور گھر میں گھس کر تلوار میان سے نکالی چاہتا

تھا کہ بنئے کا سر الگ کر دے کہ اس کی بیوی اس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی کہ خدا کیلئے کیا غضب کرتے ہو۔ یہی تمھارا غصّہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچّوں پر ہاتھ صاف کرو کیونکہ تمھارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ ماں کو روتا دیکھ بچّے اس طرح ڈاڑھیں مار مار کر روئے کہ میرا تو دل ہل گیا۔ اور دوڑ کر سب کے سب باپ کو لپٹ گئے۔

اُن کی یہ حالت دیکھ کر خاں صاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان میں کھونٹی سے لٹکا دیا اور بی بی سے کہا اچھا تو نیک بخت۔ پھر مجھ کو اس بے عزّتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔

بی بی نے کہا بلا سے جو چیز گھر میں ہے اس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ہوگی۔ دیکھی جائے گی۔ تو چلّی پانی پینے کا کٹورا نہیں معلوم کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں۔ بس یہی اس گھر کی کل کائنات تھی چاندی کی دو دو چوڑیاں لیکن ایسی پتلی جیسے تار اس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ سب سامان خاں صاحب نے باہر لا کر اس بنئے کے روبرو رکھ دیا۔ اوّل تو بنیا اُن چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سُنا۔ یہاں تک کہ ان سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا۔ انھوں نے بھی بنئے کو سمجھایا۔ بارے خدا خدا کر کے وہ اس بات پر رضا مند ہوا کہ پانچ روپئے اصل اور دو روپئے سود ساتوں کے ساتوں دیں تو فارغ خطی لکھ دے۔ لیکن خاں صاحب کا کُل اثاثہ چار ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ڈھائی روپے کی کسر رہ گئی ہے۔ بی بی

نے کہا، اب کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں۔ ہاں لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں دیکھو جوان کو ملا کر پوری پڑے۔ وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی۔ بس بعینہ جتنی ہماری حمیدہ ماں جو لگی بالیاں اُتارنے تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل میں کہا کہ الٰہی اس وقت مجھ سے اس کی کچھ بھی مدد نہیں ہو سکتی فوراً خیال آیا کہ ایک روپیہ اور کوئی دو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں۔ دیکھوں ٹوپی بک جائے تو شاید خاں صاحب کا سارا قرضہ چُک جائے۔ بازار تو قریب تھا ہی فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال سے تو سر کو لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے کر ایک گوٹے والے کو دکھائی۔ اس نے چھ کی آنکی میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا لا بلا سے چھ ہی دے۔ غرض چھ وہ اور ایک میرے پاس نقد تھا ہی ساتوں روپے لے میں نے چپکے سے اس عورت کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ تب تک پیادے خاں صاحب کو گرفتار کر کے لے جا چکے تھے۔ اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتاً پورے سات روپے ہاتھ میں دیکھ اس عورت پر ایک شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور اس خوشی میں اس نے کچھ نہیں سوچا کہ یہ روپیہ کیسا ہے۔ اور کس نے دیا ہے تو اپنے ہمسائے کو روپے دے کر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ بات کی بات میں خاں صاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو کیسی خوشی کہ کودیں اور اُچھلیں۔ کبھی باپ کے کندھے پر اور کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پر ایک۔

اب اس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوں سے بولی۔ کم بختو! کیا اُدھم مچائی ہے اور میری طرف اشارہ کر کے کہا دعا دو اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو جس نے

آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں نہیں ٹکڑا بھی مانگا نہیں ملتا۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اس کو تمھارا درد ہوتا۔ اور اس مصیبت کے وقت دست گیری کرتا؟ صرف ایک باپ کے دم کا سہارا ہے کہ اللہ رکھے اس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو محنت اور مزدوری سے خدا کا شکر ہے۔ روکھی سوکھی روز کے روز دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت ملے تو جاتی ہے۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان نہ پہچان، نہ رشتہ نہ ناتہ اور اس اللہ کے بندے نے بھر مُٹھی روپے دے کر آج ہم سب کو نئے سرے سے زندہ کیا۔ وہ بچے جس شکر گزاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے اس کی مسرّت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں۔ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی جیسی کہ اس دن ہوئی تھی مگر دونوں میاں بیوی کے ذہن میں اس وقت تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے وہ روپیہ ان کو دے دیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے۔ میں کھسکنے کو تھا کہ وہ عورت زبردستی مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی۔ میں ہر چند منع کرتا رہا جلدی سے اُس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ کر مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور میاں سے بولی، نوج کوئی تم جیسا بے خبر ہو۔ کھڑے کیا ہو، جاؤ ایک گلوری بازار سے میاں کیلئے بنوا لاؤ۔

میں ...... نہیں میں پان نہیں کھاتا۔ تکلیف مت کرو

عورت ...... بیٹا تمھاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمھارے تلوؤں میں بچھا دوں قربان اس پیاری پیاری صورت کے نثار بھولی بھولی شکل کے بیٹا تم یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟

میں: میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں

عورت: پھر بیٹا! یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لو گے؟ ہم اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمہارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے۔ مگر کام ان دنوں مندا ہے۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑے گا دو ہی مہینے میں مگر جہاں اتنی مہربانی کی ہے لِلّٰہ اتنا سلوک اور کرو کہ دو روپیہ مہینہ قسط کا لے لیا کرو۔

میں...... آپ روپے کے ادا کرنے کی کچھ فکر نہ کیجئے میں نے لینے کی نیت سے نہیں دیا۔

یہ سن کر تمام خاندان اس قدر خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا، میں ان میں اس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جیسے خوش دل اور شکر گزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقۂ مریدان ارادت مند میں کوئی پیرو مُرشد۔ اُس عورت کے منہ سے مارے خوشی اور شکر گزاری کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی اور آنکھوں کو لگاتی تھی۔ اس کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں، پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیہ دیا۔ پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ بچھی جاتی تھی۔ سات روپے کی بھی کچھ حقیقت تھی۔ مگر اس نے مجھے سینکڑوں ہزاروں کی دعائیں دی ہوں گی۔ اس نے جو اتنی احسان مندی ظاہر کی میں اُلٹا اُسی کا ممنون ہوا۔ جس قدر وہ خوشامد کرتی تھی۔ میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی۔ میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔ غرض میں وہاں سے رخصت ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے سیدھا گھر لوٹ آیا۔ عین

گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔انھوں نے میری ہیئت کذائی دیکھ کر تعجب کیا اور پوچھا کہ آئیں۔کیا ٹوپی کے بدلے چنے لے کھائے؟ میں نے کچھ جواب نہیں دیا، اس واسطے کہ مجھ کو اس بات کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔شام کو بھائی جان سے اور اماں جان سے تکرار ہوئی۔بھائی جان کچھ روپے مانگتے تھے اور اماں جان کہتی تھیں کہ بیٹا ان فضول خرچیوں سے گھر کئے دن چلے گا،لو پرسوں میں نے چار روپے دیے تم نے چاروں کے چاروں برابر کئے۔ناخن بھر چیز تم گھر میں لائے ہو تو بتا دو؟ اتنا چٹوراپن ایسا اسراف! بھائی جان نے کہا، میں چٹورا نہیں ہوں۔چٹورے تمہارے منجھلے صاحبزادے ہیں جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی ہو کہ سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے۔اماں جان نے مجھ کو بلا کر پوچھا، میں نے کہا اگر بیچ کر کھا جانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

اماں جان ...... پھر کیا کہیں کھو دی؟

میں ...... کھوئی بھی نہیں

اماں جان ...... بھائی تو،تو عجیب تماشے کا لڑکا ہے بیچی نہیں۔کھوئی نہیں۔ پھر ٹوپی گئی تو کہاں گئی؟

میں ......اگر آپ کو میری بات کا اعتبار ہے تو بس سمجھ لیجئے کہ میں نے کہیں اس کو بیجا طور پر صرف نہیں کیا۔

اماں جان...... اگر یہی تمہارے لچھن ہیں تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبو دیا۔

میں اس وقت عجیب مشکل میں مبتلا تھا ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا

اور بے ظاہر کیے بن نہیں پڑتی تھی۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

مگر مجھ کو یقین کہ جب میرا معاملہ پاک صاف ہے تو گویا بالفعل بھائی جان کے کہنے اور میرے چپ رہنے سے اماں جان کو ایک بدگمانی ہوگئی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ضرور ان کے دل سے خدشہ دفع ہو ہی جائے گا۔ اور کچھ نہ ہوگا تو میرے اگلے پچھلے فعلوں کو دیکھ کر سمجھ لیں گی کہ بیٹا بدراہ نہیں ہے۔ نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے۔ سو خدا کی قدرت ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی تو اماں جان اس کی عیادت کو گئیں۔ میں اُن کے ساتھ تھا۔ ابھی اماں جان سواری سے نہیں اُتری تھیں کہ اُدھر سے وہی خاں صاحب چلے آرہے تھے کہ مجھ کو دیکھ کر دور ہی سے دعائیں دینے لگے اور ایسے تپاک اور دل سوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی جیسے کوئی اپنا بزرگ اور اپنا عزیز دریافت حال کرتا ہے۔ خیر میں نے تو مناسب حالت جواب دیا۔ اماں جان آخر یہ سب باتیں پردے کے اندر بیٹھی ہوئی سُن رہی تھیں۔ اُترتے کے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا علیم! یہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کرتا تھا۔

میں...... یہ ایک خاں صاحب ہیں اور میاں مسکین کے کوچے میں رہتے ہیں، بس میں اسی قدر جانتا ہوں۔

اماں جان...... لیکن یہ باتیں تو تم سے ایسے گرویدہ ہو ہو کر کرتے تھے گویا برسوں کی جان پہچان ہے۔

میں...... نہیں! شاید ان کو میرا نام بھی معلوم نہیں۔

اماں جان...... پھر تمہارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے؟

میں ...... بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف میں بھی بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میرے جواب سے اماں جان کی تشفی نہیں ہوئی مگر اندر جانے کی جلدی تھی، چلی گئیں۔ خاں صاحب نے کہیں اپنے گھر میرا تذکرہ کیا۔ میں تو گھر چلا آیا۔ مگر یقین ہے کہ ان کی بیوی اماں جان کے پاس گئیں اور میرے اس ٹوپی بیچنے اور روپے دینے کا تمام ماجرا بیان کیا۔ پھر جو اماں جان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں کہ علیم ہم نے تمہاری چوری آخر پکڑ ہی لی۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ میری چوری؟

اماں جان ...... ہاں تمہاری چوری

میں ...... بھلا میں بھی تو سنوں

اماں جان ...... پہلے تم ٹوپی کا حال بتالو تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سنو۔ اس کہنے سے میں سمجھ گیا اور ہنس کر چپکا ہو رہا۔

باپ ...... بے شک جتنی باتیں تم نے بیان کیں داخل ہمدردی خصوصاً یہ خاں صاب کا قصہ ہمدردی کی ایک اعلیٰ درجے کی مثال ہے۔ لیکن چشمے سے پہلے وہ سیراب ہونے چاہئیں جہاں سے وہ چشمہ نکلا ہے۔ اسی طرح پہلے اپنے عزیز و اقارب نیکی اور سلوک کے مستحق ہیں۔

بیٹا ...... میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرے قریب کے رشتہ دار میرے سلوک کے حاجت مند نہیں ہیں۔ اور خدا نے ان کو مجھ سے بے نیاز اور مستغنی کیا ہے۔

باپ ...... کیا سلوک صرف روپے پیسے ہی کے دینے سے ہوتا ہے؟

بیٹا...... میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا

باپ...... نہیں جو جس چیز کا حاجت مند ہے اس کا رفع حاجت کرنا ہمدردی اور نفع رسانی ہے۔ ہمارا خاندان دینداری سے بے بہرہ اور خداشناسی سے بے نصیب ہے اور شیوۂ خدا پرستی میں ہر ہر متنفّس کو تعلیم و تلقین کی حاجت اور وعظ و نصیحت کی ضرورت ہے تم نے اس فرض کو ادا کرنا تو درکنار ابھی تک فرض ہی نہیں سمجھا۔

بیٹا...... آپ بجا فرماتے ہیں مجھ سے غلطی ہوئی۔

حصّہ (الف) سوالات:

1) سرکاری پیادے خاں صاحب کے گھر کو کیوں گھیرے ہوئے تھے؟

2) بنئے کا قرضہ چکانے اور بے عزتی سے بچنے کی بیوی نے اپنے شوہر کو کیا تدبیر بتائی۔

3) علیم نے میاں مسکین کی مدد کیلئے سات روپیوں کا بندوبست کیسے کیا؟

4) باپ کے چھوٹ آنے پر بچے جب اچھل کود کرنے لگے تو ماں نے انہیں علیم کے بارے میں بتاتے ہوئے کیا کہا؟

5) اماں کو بیٹے کی دستگیری کا پتہ کب اور کیسے چلا؟

6) ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے اور جملوں میں استعمال کیجیے۔

1) ادھار 2) تہی دست 3) غیرت مند

4) شادی مرگ 5) اسراف

حصّہ (ب) بحوالۂ متن تشریح کیجئے

1) میاں اچھی کہی برسوں کا ناواں اور روج ٹال مٹول، بھگوان جانے ابھی تو کھان صاحب کی اجّت اتروائے لیتا ہوں۔

2) نوج کوئی تم جیسا بے خبر ہو، کھڑے کیا ہو جاؤ ایک گلوری بازار سے میاں کے لئے بنوالاؤ۔

3) علیم ہم نے تمہاری چوری آخر پکڑ ہی لی۔

حصّہ (ج) ذیل کے سوالات کے تفصیلی جوابات لکھئے

1) علیم نے غریب خان صاحب کا قرضہ چکانے میں جو مدد کی۔ اس کے بارے میں تفصیل سے لکھئے

2) ''دستگیری'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

روپیہ عالم سکرات میں

خواجہ حسن نظامی

نام علی عرف حسن نظامی ہے۔آپ کی پیدائش 1778ء میں بمقام پرانی دہلی ہوئی۔خواجہ حسن نظامی اپنے دور کے ایک زبردست مصنف اور ادیب تھے۔ان کی کتابوں کی مجموعی تعداد سو سے زیادہ ہے۔اردو میں شاید ہی کوئی دوسرا ادیب اتنی زیادہ کتابوں کا مصنف ہو۔

اردو میں انشائیہ کی صنف کو مقبول عام بنانے میں خواجہ صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے۔آپ ان کی کتاب ''سی پارہ دل'' کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کس خوبی سے ایک مختصر مضمون اور بے جان چیز مثلا ''لالٹین یا برف'' وغیرہ سے وہ سوتے ہوئے دلوں کو بیدار کردیتے ہیں۔

ان کا انداز تحریر اپنے اندر ایک خاص ندرت اور تاثیر رکھتا ہے۔ان کی عبارت میں بلا کی آمد اور روانی ہوتی ہے۔ان کی تحریروں میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ان کے فقرے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔جن میں ہلکی ہلکی مزاح اور بعض اوقات طنز کی چاشنی بھی ہوتی ہے تاہم ٹھوس علمی وادبی موضوعات کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا اور زیادہ تر ہلکے پھلکے انشائیے ہی لکھتے رہے۔حسن نظامی کا انتقال 31/جولائی 1955ء میں ہوا۔

عقل وعلم کی انتہایا عروج کے ایّام میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہوجاتی ہے جو دولت سے بے پرواہ اور بعض حالتوں میں اس سے نفرت کرنے والی نظر آتی ہے۔ یونان میں کلبی حکماء اسی قسم کے لوگ تھے جو دولت اور اہل دولت سے بیزار، بے سروسامان زندگی بسر کرتے تھے اور دولت کے ملبوث آدمیوں سے ان کا برتاؤ اس قدر بُرا اور سخت ہوتا تھا کہ عوام ان کو کھنا کُتّا کہتے تھے۔ اسی بناء پر اہل عرب نے اس جماعت کا نام کلبیہ (کتّے والی) لکھا ہے۔ اسی جماعت میں دیو جانس کلبی حکیم گزرا ہے جو ایک چوبی ظرف سر پر رکھے رہتا تھا اور جب آرام کرنا چاہتا تو اسی ظرف میں سکڑ کر لیٹ جاتا تھا۔ بس یہی اس کا مکان تھا اور یہی اس کی دولت تھی۔ سکندر نے جب اس کا شہر فتح کیا تو یہ اپنے چوبی پیالہ میں پڑا سو رہا تھا۔ سکندر اس کے سرہانے گیا اور لات مار کر کہا۔ ''اُٹھ میں نے تیرا شہر فتح کرلیا''۔ دیو جانس نے پڑے پڑے جواب دیا ''ملک فتح کرنا بادشاہوں کا کام ہے اور لات مارنا گدھوں کی خصلت ہے''۔

یہی دیو جانس کلبی تھا جس کے پاس ایک دن سکندر گیا اور کہا کہ مجھ سے کچھ ضرورت ہو تو فرمایئے تا کہ اس کو پورا کروں حکیم نے کہا بس یہی ضرورت ہے کہ آپ دھوپ چھوڑ کر ذرا پرے ہٹ جایئے''۔

اس بے پروائی اور بے باکی کو دیکھ کر سکندر نے کہا تھا کہ ''اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیو جانس ہوتا'' اس فرقہ کی یہی بے نیازیاں اور بے باکیاں تھیں جنکے سبب وہ کٹ

کھنے کتے کہلاتے تھے۔

ہندوستان میں جب عقل وعلم کا عروج ہوا تو ایسا تارک دُنیا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اسباب دولت کو زندگی اور اس کی خوشی کیلئے ضروری نہ سمجھتا تھا اور خوشی اور اطمینان کو ترک دولت سے حاصل کرنا اچھا خیال کرتا تھا، اس کے بعد اس نے اور ترقی کی اور یہ خیال پھیل گیا کہ دولت اطمینان اور خوشی کی دشمن ہے اور جہاں یہ ہو وہاں راحت وتسلی کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ شانتی ترکِ تعلقات اور ترکِ اسبابِ دنیا سے حاصل ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی ابتدائی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بانی اسلام شروع سے دولت کی ناجائز محبت کے مخالف تھے اور قرآن کی تعلیم، اپنی عملی واعتدالی عادت کے موافق بالکل ترک کرنے کا حکم نہ دیتی تھی۔ اس کا منشا صرف یہ تھا کہ ضروریاتِ زندگی کے لئے دولت حاصل کرو، مگر دولت کو زندگی کا مقصد نہ بناؤ۔

مسلمانوں پر شروع کا زمانہ اسبابِ دولت کے اعتبار سے بھی نہایت سخت تھا اُن کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھکنے کو پورا کپڑا میسر نہ آتا تھا ان کے پاس جنگ کے ہتھیار اور دیگر لوازمات بھی پوری طرح نہ تھے۔ ان کے رسولؐ فاقے کرتے تھے یا جو کا بے چھنا آٹا کھاتے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں اور ملکوں کے مالک بن گئے تب بھی انھوں نے تیس برس تک اپنی فقیرانہ زندگی کو نہ بدلا اور دولت کی محبت کو پاس نہ آنے دیا۔

یورپ اور امریکہ کی عقلی اور عملی ترقی کا دور آیا تو اس نے اپنی ہر ترقی کا مطمحِ

نظر دولت کو قرار دیا۔ حکومت میں دولت، تفریح میں دولت، غرض کوئی دینی و دنیوی کام ایسا نہ بچا جس میں دولت مقصود اصلی نہ سمجھی گئی ہو کوئی ایجاد ہوئی تو دولت کمانے کا خیال مدنظر رہا کوئی عملی درس گاہ قائم ہوئی تو اس میں سوچا گیا کہ ترقی دولت کیلئے کیوں کہ یہ کارآمد ہوسکے گی۔ اس دولت پرستی کی اتنی کثرت ہوئی کہ یورپ وامریکہ کی تمام دماغی قوتیں دولت جمع کرنے میں مصروف ہوگئیں اور انھوں نے دولت کے پہاڑ جمع کرلئے مگر باوجود اس کے وہاں ہر فرد دولت کمانے اور جمع کرنے میں مصروف نظر آتا تھا۔ بے شمار غریب اور بے دولت بھی ان میں باقی رہے اور دولت تمام افراد میں برابر مساوی تقسیم نہ ہوسکی۔

یورپ اور امریکہ نے علمی ترقی کے دوران میں تمدنی اور معاشرتی ترقی بھی کی تھی اور اپنی بودوباش کو اتنا مکلّف اور آراستہ بنالیا تھا کہ ایک آدمی کو صبح، دوپہر، شام، رات کھانے، سونے کے لئے، ملنے جلنے کے بے شمار کپڑے پہننا پڑتے تھے اور کھانا اگر کوئی آدمی چار آنے کا کھاتا تو میز اور برتنوں اور دیگر سامانِ آرائش میں چار روپے خرچ کرنے پر مجبور تھا۔ اس واسطے ان کو رات دن دولت کمانے کی ضرورت رہتی تھی۔ تمدن اور معاشرت کے اُن لاانتہا مکلفات کا مقصد عیش تھا۔ لطف خوشی کا ایک ٹکڑا ہے جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ علم دولت کے لئے، دولت عیش کے لئے اور عیش خوشی کیلئے، حکومت دولت کے لئے، صنعت وحرفت تجارت وطبابت وغیرہ بھی سب دولت کے لئے اور دولت عیش کے واسطے ہے۔ اور عیش کا مقصد خوشی ہے دُنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے۔ جو خوشی اور اطمینان نہ چاہتا ہو جو لوگ دولت کو

مقصود زندگی اور مطلوب زیست نہیں سمجھتے وہ خوشی کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی خوشی دولت اور پُر عیش کے دور دراز راستہ سے نہیں آتی بلکہ ایک بہت قریبی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جہاں دولت اور تکلفات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سوامی رام تیرتھ جب امریکہ گئے اور وہاں کے پہلے ریلوے اسٹیشن پر ان کو ایک امریکن اخبار نویس نے بے سروسامان دیکھا کہ سوا بدن کے کپڑوں کے اور کچھ اسباب ان کے پاس نہیں ہے۔ تو اس نے تعجب سے پوچھا کہ تمہارا اسباب کہاں ہے؟ سوامی جی نے جواب دیا۔ ''رام بے اسباب آیا ہے اور بے اسباب جائے گا۔ ایڈیٹر نے کہا'' اس ملک میں بے اسباب بھوکا مرجاتا ہے۔ اور رہنے کو جگہ نصیب نہیں ہوتی۔'' سوامی جی نے جواب دیا۔ ''دریا کی ریت میرا بستر ہے اور جنگل کے پتے میری خوراک ہیں۔ تم میرے لئے مکان و خوراک کی فکر نہ کرو''۔ اور یہی ہوا کہ جب امریکہ میں ان کے لکچر ہوئے تو امریکہ کی دولت ان کی طرف دوڑتی تھی۔ اور وہ اس جگہ سے بھاگتے تھے۔ سوامی رام تیرتھ کی خوشی لامحدود تھی۔ حالانکہ ان کے پاس دولت نہ تھی۔ اور دولت کا تمدنی سامان نہ تھا۔ سوامی رام تیرتھ کی خوشی اور مطمئن زندگی پر امریکن دولت رشک کرتی تھی۔ اور ان کے قدموں پر گری پڑتی تھی۔ اور اس کا گرنا اس لئے تھا کہ سوامی جی دماغی اور روحانی کمال رکھتے تھے گو دولت ان کے پاس نہ تھی۔

گذشتہ جنگ یورپ کا اصلی سبب یہی دولت پرستی تھا۔ ہر قوم اپنی تجارت کے فروغ کے خواہش مند اور اس کے حارج راستوں کو صاف کرنا چاہتی ہے اور اب جبکہ صلح کانفرس کی مجلسیں گرم ہیں۔ تب بھی دولت پرستی کا خیال قوم کے سامنے ہے۔

یورپ وامریکہ میں خودغرضانہ دولت جمع کرنے کی اندھا دھند عادت اور بے انتہا طمع کو دیکھ کر وہ گروہ جو قدرتی طور سے غریب تھا اور باوجود یورپ اور امریکہ میں دولت کے دریا بہتے تھے۔ اس نے سوشلسٹ کے نام سے اپنی ایک جماعت قائم کرلی جو رفتہ رفتہ تمام یورپ وامریکہ اور ایک حصہ ایشیا پر پھیلنے لگی۔

آخر قدرت نے دولت اور دولتمندی میں ایک متعدی وبا بھیجی جو رفتہ رفتہ دولت کو فنا کرتی جاتی ہے۔ دولت کی موت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دولت تباہ ہو جائے یا اس کا حاصل کرنا ترک کردیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کو زندگی کا اصلی مقصود نہ سمجھا جائے اور عزت اور خوشی کی خرید دولت پر منحصر نہ رہے، نہ یہ ہو کہ ایک آدمی تو اتنا دولتمند ہو جائے کہ اپنے خزانوں کا شمار نہ کرسکے اور لاکھوں آدمی اس کے محتاج ہوں اور اس کی دی ہوی مقررہ اور بہت کم روٹی کھانے پر مجبور کئے جائیں۔ سوشلسٹ جماعت کا اصول سب کو معلوم ہے کہ وہ دولت کی بے تحاشا حرص اور اس کے خزانے جمع کرنے کے خلاف ہے وہ نہیں چاہتی کہ چند افراد تو عالیشان محلوں میں رہیں، عمدہ عمدہ کھانا کھائیں، اچھے اچھے کپڑے پہنیں، بڑھیا سے بڑھیا سواریوں میں سوار ہوں، بے شمار خزانہ رکھیں اور ان کے لاکھوں بھائی نہ اچھا اور پیٹ بھر کھانا کھاسکیں نہ پوری طرح سردی وگرمی کے بچاؤ کے قابل ان کو کپڑا مل سکے، نہ زندگی کی معمولی ضروریات ان کو نصیب ہوں وہ چاہتے ہیں کہ دولت اور معیشت میں سب انسان برابر رکھے جائیں۔ سب کو مکان، کھانا، کپڑا اور ضروریات زندگی مساوی شان کی حاصل ہوں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اپنے حالات اور لیاقت کے بموجب ہر

شخص محنت کرے اور کوئی شخص بے کار کاہل نہ رہے گویا محنت بھی مساوی کر دینا ان کا مقصد ہے۔

میرے عنوان کے لحاظ سے ان کا یہ اصول قابل غور ہے کہ وہ روپے کو عزت اور خوشی کا ذریعہ نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم اپنے موجودہ حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کے یہاں روپیہ والا ہونا عزت کا موجب ہے۔ علم وعقل کی شرافت کی کچھ پرسش نہیں ہے۔ بہت جاہل بہت احمق، بہت کمینے، بہت بدافعال لوگ دولتمند ہونے کے سبب حکومت میں معزز سمجھے جاتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ ٹیکس دیتا ہو وہ سب سے زیادہ عزت دار ہے۔ خطابات بھی دولت کے انبار والوں کو عموماً زیادہ ملتے ہیں۔ ہماری حکومت کا ذاتی قصور نہیں ہے بلکہ یورپ کی مروجہ رسم زندگی ہی یہ ہے کہ دولت کو عزت وآبرو سمجھا جاتا ہے۔

وہ (سوشلسٹ) یہ بھی چاہتے ہیں کہ روپے کے زور سے حکومت جو کیجاتی ہے اس کو بدل دینا چاہیئے اور روپیہ کو انسان پر کسی حیثیت سے کسی قسم کی فوقیت وحکومت نہ دینی چاہیئے، آجکل روپیہ یا دولت ہر اعتبار سے آدمیوں پر قابض ہے اور آدمی کی عقلی وذہنی وعلمی قوتیں روپیہ کی قوت سے مغلوب نظر آتی ہیں۔ پہلے زمانے میں تو صرف خدا کی طلب اور عالم آخرت کی تلاش کے مقصد سے اور عقلی عروج کے تقاضے سے دولت کو حقیر سمجھا جاتا تھا اور اس کی محبت سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی تھی۔ جیسی کہ فلاسفروں اور حکیموں اور سنیاسیوں اور صوفیوں کی حالت تھی اس واسطے دنیا میں روپیہ کی مغلوبیت ایک محدود جماعت میں نظر آتی تھی۔ مگر روپیہ کے غلبہ نے تمام دنیا

6

کی زندگی کو بے چین کر دیا ہے اور ہر قوم روپیہ کی غلامی سے دق اور پریشان ہو گئی ہے یہاں تک کہ جو خود دولت مند ہیں وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ دولت اور اس کا سنبھالنا ان کی خوش باش زندگی کیلئے وبال جان ہے۔اور کوئی لمحہ بھی خوشی کا روپیہ والوں کو نصیب نہیں ہوتا۔یورپ اور امریکہ کی شہری زندگی سوسائیٹی کی زنجیروں سے مرتب ہوتی ہے۔اور روپیہ ہر سوسائیٹی کو مرتب کرتا ہے اور روپیہ کی ترتیب ایسے خودمختار اور جبار حاکم کی شان رکھتی ہے کہ وہ سب سوسائٹیاں باوجود دعویٰ آزادی کے روپیہ کی بدترین غلام بنی ہوئی ہیں۔اور اس کے تمام افراد اس سفاک بادشاہ کی محکومیت سے نکلنا چاہتے ہیں، خواہ وہ جدید تحریکوں سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں، خواہ ان کو اشتراکیت کے اصول سے سراسر نفرت اور عداوت ہو مگر وہ اس کو دل سے محسوس کرتے ہیں کہ روپیہ کی سلطنت نے انسان کی اصلی انسانیت کو شل کر دیا ہے۔اور انسان کی ہر وہ اعلیٰ قابلیت جس سے وہ حقیقی انسان خوش باش انسان بن سکتا ہے۔ روپیہ کے جبریہ اور فولادی پنجہ سے جکڑی ہوئی ہے اور اس کو آزاد ہونے کی بڑی ضرورت ہے۔روپیہ انسان کا غلام بن کر رہے نہ کہ آقا ہو کر، روپیہ کو آدمی کا تابعدار و خدمت گذار ہونا چاہیئے۔مگر وہ اس کا سرکش مالک بنا ہوا ہے۔روپیہ اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کو انسان کے مقصدی راستہ سے الگ ہٹ کر آباد ہونا چاہیئے کہ آدمی بھی کسی کام کیلئے پیدا ہوا ہے۔

دنیا کی موجودہ حالت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ روپیہ کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور جن دولت پرست دماغوں نے دولت کے نشے میں بہک کر

کروڑں بے دولت دماغوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ دوامی طور سے حاکم نہیں رہ سکتے اور تو عنقریب دولت کے غلبہ سے دست بردار ہونا پڑیگا، اور ان کی حاکمی دولت کے پنجہ میں دولت کے دکھاوے نہ ہونگے بلکہ اس کی صورت بدل کر دولت کی محکومیت کی شکل میں آجائینگے اسی کو دولت کی موت کہنا چاہیئے۔

میں نے لکھا ہے۔ ''روپیہ عالم سکرات میں'' اس کا مقصد یہی ہے کہ روپیہ گو ابھی تک زندہ ہے لیکن اس کی زندگی چند سانس کی باقی رہ گئی ہے اور اپنی معاشی اور تمام ضروریات زندگی میں اس کا جسم اپنی حاکمانہ ومختارانہ روح سے خالی ہونا چاہتا ہے۔

مذہب خواہ کوئی ہو یہی کہتا ہے کہ آدمی دولت کا حاکم بنکر رہے۔ محکوم نہ ہو۔ مگر مذہب کو مذاق میں اُڑادیا گیا اور معیشت کی ضرورت نے انسان کو پریشان کر کے آخر اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ دولت کی محکومیت ترک کرے اور حاکمیت پر پہنچے، گو ابھی تک دنیا کی بسر اوقات کا سارا جھگڑا دولت اور روپیہ کا اسیر نظر آتا ہے۔ اور روپیہ کی جان کنی پر یقین کرنا دشوار ہے لیکن جن کو انسانی جنس کی جسمانی اور جسم کے اندر کی باطنی حالت کا زیادہ علم ہے یا وہ اس پر غور کرتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ روپیہ جانکنی اور سکرات کے عالم میں مبتلا ہے اور کچھ دیر کے بعد مرجائے گا۔

سوالات حصہ الف:

1) یونان میں کلبی حکماء کس قسم کے لوگ تھے؟

2) عوام کن لوگوں کو کھنا کُتّا کہتے تھے؟

3) دیو جانس کون تھا اور اس کا کل اثاثہ کیا تھا؟

4) دیو جانس نے سکندر کو کیا جواب دیا؟

5) دیو جانس کی بے پروائی اور بے باکی کو دیکھ کر سکندر نے کیا کہا؟

6) وہ کونسا گروہ تھا جو دولت کو اطمینان اور خوشی کا دشمن سمجھتا تھا؟

7) مسلمانوں نے شروع کا زمانہ اسباب دولت کے اعتبار سے کس طرح گزارا؟

8) یورپ اور امریکہ کی عقلی اور عملی ترقیوں پر کونسی چیز غالب آ گئی؟

9) سوامی رام تیرتھ سے ایک امریکن اخبار نویس نے کیا پوچھا اور انہوں نے اُسے کیا جواب دیا؟

10) سوامی رام تیرتھ کی خوشی اور مطمئن زندگی پر امریکن دولت کیوں رشک کرتی تھی؟

11) دولت کی موت کا کیا مطلب ہے؟

12) سوشلسٹ جماعت کا اصول تحریر کیجئے؟

(ب) ان الفاظ کے معنی لکھیے۔

بے باکی :	عروج :	تارک دنیا :
بود و باش :	مکلّف :	حارج :
طمع :	غلبہ :	محکوم :
محکومیت :		

(ج) بحوالہ متن تشریح کیجیے

1) ''اٹھ میں نے تیرا شہر فتح کرلیا'' دیو جانس نے پڑے پڑے جواب دیا ''ملک فتح کرنا بادشاہوں کا کام ہے اور لات مارنا گدھوں کی خصلت ہے۔

2) حکیم نے کہا بس یہی ضرورت ہے کہ آپ دھوپ چھوڑ کر ذرا پرے ہٹ جائیے

3) ''رام بے اسباب آیا ہے اور بے اسباب جائے گا''

4) ''دریا کی ریت میرا بستر ہے اور جنگل کے پتے میری خوراک ہیں۔
تم میرے لئے مکان و خوراک کی فکر نہ کرو۔

5) روپیہ انسان کا غلام بن کر رہے نہ کہ آقا ہو کر، روپیہ کو آدمی کا تابعدار و خدمت گذار ہونا چاہیے۔

(د) تفصیلی جوابات لکھیے

1) روپئے کے غلبے سے دنیا کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں یورپ اور امریکہ کی طرز زندگی کے حوالے سے لکھیے۔

2) سوشلیسٹ جماعت کے اصول بیان کرتے ہوئے یہ بتایئے کہ وہ کس طرح کی زندگی پر زور دیتے ہیں۔

3) ''روپیہ عالم سکرات میں'' اس مضمون کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

سوتیلی ماں کا آخری وقت

راشد الخیری

راشد الخیری 1868ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد عبدالراشد تھا۔ ان کے خاندان میں ایک مشہور بزرگ مولوی خیر اللہ گزرے ہیں۔ انھیں کے نام کی نسبت سے اپنا قلمی نام راشد الخیری رکھا۔ مولوی نذیر احمد نے جو ان کے پھوپھا تھے ان کو تعلیم کی طرف لگایا۔ رفتہ رفتہ ان کی طبیعت حصول تعلیم کی طرف اتنی راغب ہوئی کہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر علمی مشاغل میں مشغول ہوئے۔ پہلے رسالہ ''مخزن'' میں مضامین لکھتے رہے بعد میں اس کے مدیر ہوگئے۔ اس کے بعد ''عصمت'' ''تمدن'' اور ''سہیلی'' جیسے رسالے نکالے۔ انھوں نے ساری عمر قلم اور زبان کے ذریعے عورتوں کی اصلاح اور ہمدردی میں گزاردی۔ ان کی تصانیف کی تعداد اسّی کے قریب ہے ''صبح زندگی'' ''شام زندگی'' اور ''سیّدہ کا لال'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کی تحریر میں درد و غم بہت نمایاں ہے۔ اسی لیے ان کو ''مصوّر غم'' کہا جاتا ہے۔ باتیں سچی اور دل پر اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ عبارت میں بڑی روانی

اور سادگی ہوتی ہے۔ الفاظ ماحول سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کے کردار جان دار اور جیتے جاگتے ہوتے ہیں راشد الخیری کا انتقال 3ر فروری 1936ء کو دہلی میں ہوا۔

بیٹیو! تمہاری طرح ایک دن میں بھی کنواری تھی۔ ماں باپ کا سایہ میرے سر پر موجود تھا۔ اطمینان کی باتیں مگر جوانی نے اس بے فکری کا خاتمہ کر دیا۔ شادی کے پیغام آنے شروع ہوئے۔ میں بہ ظاہر خاموش تھی مگر نکاح میری زندگی اور موت کا فیصلہ تھا تمام گفتگو غور سے سنتی رہی مگر اس لیے کہ محض واقعات پر نتیجہ نکالنا ہوتا تھا، میں ''اماں'' ابا کی رائے کو اس واسطے کہ وہ تجربہ کار تھے، اپنے سے بہتر سمجھتی تھی۔ پھر بھی آج جب کہ نو برس سے زیادہ ہوئے ہیں، زبان سے نکالتی ہوں کہ اماں جان کے ایک پیغام سے انکار کرنے کا مجھ کو اتنا رنج ہوا کہ میں نے دو وقت روٹی نہیں کھائی۔ یہ میرے چچازاد بھائی کا پیغام تھا لیکن آخر کار ان کی رائے ٹھیک نکلی اور میرا خیال بالکل غلط نکلا۔ اس شخص نے پے در پے تین بیویاں کیں اور تینوں کو جلا جلا اور گھلا گھلا کر پار اتارا۔ جب اماں جان نے اس گھر کو جس میں ہم سب بیٹھے ہیں پسند کیا اور رضامندی ظاہر کی تو مجھ کو سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ ان دونوں کلیجے کے ٹکڑوں کو جو میرے پاس بیٹھے رو رہے ہیں کہنے کو سوتیلے مگر پیٹ کے بچوں سے زیادہ عاشقِ زار، کس طرح خوش رکھوں گی۔ یہی دھڑکا تھا جس کو ساتھ لئے میں سسرال میں داخل ہوئی۔ سرکار نے جیسا دنیا کے تمام مردوں کا قاعدہ ہے میری صورت دیکھتے ہی بچوں کی

وقعت کم کردی۔ ان کا کھانا پینا پہننا اوڑھنا سب میرے ہاتھ میں تھا۔ میں خود بچہ تھی اور ان بچّوں کی خدمت میرے بس کا کام نہ تھا۔ پھر بھی خوف خدا میرے دل میں تھا میں سمجھتی تھی کہ دنیا کی کسی حالت کو قیام نہیں زندگی کے ساتھ انقلاب لگے ہوئے ہیں۔ یہ دو معصوم روحیں جو قدرت نے میرے سپرد کی ہیں محض میری شفقت کی محتاج ہیں۔ نہ معلوم چند روز بعد میں اس شفقت کے قابل رہوں یا نہ رہوں، میں اندھی لنگڑی، کانڑی، بیوہ ہو جاؤں اور بھیک بھی مجھ کو میسر نہ ہو، اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا میں ان کی خاطر مدارات کرتی۔ دو سال اسی طرح گزرے اور میں بھی ایک بچّے کی ماں بن گئی۔ مجھے اب اپنے بچّے کے آگے یہ دونوں زہر معلوم ہوتے اور ہر وقت یہ خواہش ہوتی کہ سرکار کی تمام محبت چاروں طرف سے کھنچ کر میری طرف آ جائے۔ میری آرزو پوری ہوئی۔ سرکار دم بھر میرے بچے سلمان کو آنکھ سے اوجھل نہ کرتے اور اپنے بچّے عرفان کو جو مشکل سے تین برس کا ہوگا ہمارے کمرے تک میں نہ گھسنے دیتے۔ اسی طرح چار برس گزر گئے۔ مجھے دن عید اور رات شب برات لگتی۔ ان سوتیلے بچّوں کا کانٹا قریب قریب نکل چکا تھا۔ یہ زندہ تھے مگر مردہ سے بدتر، میں بھی اس وقت کچھ ایسے گھمنڈ میں تھی کہ مجھے ان دونوں سے سیدھے منہ بات کرنا قسم، میں جو ہاتھ اُٹھا کر دیتی، یہ لے لیتے جو کہتی وہ کر لیتے۔ عرفان لاکھ بچہ تھا مگر چھ سات برس کا بچہ، اپنی حالت اچھی طرح پہچانتا اور اپنی عزّت پوری طرح جانتا، دن بھر میرے بچّے کے پیچھے پیچھے خوشامد کرتا پھرتا، پٹتا کٹتا، گھرکیاں سنتا اور اُف نہ کرتا، مجھ کو خود ایسے لڑکے کی ضرورت تھی جو ہر وقت سلمان کی خدمت کرے، اسکو بہلائے، کھلائے، اس کی

خدمت کرے، ان داموں عرفان مجھ کو کچھ گراں نہ تھا، سلمان کھانا کھا چکتا تو اس کے آگے کا بچا بچایا کھانا بھی اسی کو دے دیتی، پرانی دھرانی جوتی، پھٹا پرانا کرتا اسی کے کام آتا۔ گھر میں ایک توتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ گرمی کے موسم میں شام کے وقت نہانے جا رہی تھی۔ سونے کی گھڑی نکال کر میں نے رکھنی چاہی، سلمان میرے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا، گھڑی دیکھتے ہی مچل گیا، میں نے اٹھا کر صندوقچے میں چھپا دی۔ بچہ مچل گیا۔ لگا پٹخیاں کھانے، عرفان کھڑا اس کے پنکھا جھل رہا تھا، بہلایا چمکارا مگر بچہ کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ اسی سلسلے میں غریب جا کر توتے کا پنجرا اُٹھا لایا اور کہنے لگا۔

''مٹھو میاں پر ہنس رہا ہے''

وہ تو اُدھر بہلا رہا تھا اور میں غسل خانے میں پہنچی۔ ابھی اچھی طرح نہانے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے بلکنے کی آواز میرے کان میں پہنچی۔ کیسا نہانا اور کس کا غسل، جلدی سے تین لوٹے ڈال باہر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بچے کی انگلی سے خون کی تلّی بندھی ہوئی ہے اور وہ تڑپ رہا ہے۔ محبت کے مارے بے تاب اور غصّے کے مارے آگ بگولہ ہو گئی۔ انّا نے کہا موئے عرفان نے توتے سے انگلی کٹوا دی۔ اتنا سننا تھا میں آپے سے باہر ہو گئی۔ میں نے ایک غضب کی بھری ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ میرے چہرے پر تھی اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہی توتے کا پنجرا جس کی ایک تیلی ٹوٹی ہوئی تھی اٹھا کر اس کے منہ پر زور سے مارا۔ اس کے گورے گورے کلّے خون میں لہولہان ہو گئے۔ بن ماں کا بچہ اس وقت مصیبت کی

تنچی تصویر تھا۔ بے کسی اس کے چہرے پر برس رہی تھی۔ اور گھونگر والے بال اس کے بے گناہی کی داد دے رہے تھے۔ اس معصوم کی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑیاں بہا رہی تھیں۔ اس کے کپڑے خون سے شرابور تھے۔ ڈر کے مارے آواز بند تھی اور آٹھ برس کی جان میرے سامنے بیری کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں اس حالت میں غصّے میں بھری سلمان کو گود میں لیے اپنے کمرے میں پہنچی۔ وہ سو گیا تھا۔ پلنگ پر لٹا دیا۔ اتنے ہی میں سرکار تشریف لے آئے۔ میں سلمان کو کلیجے سے لگائے بیٹھی تھی، دیکھتے ہی گھبرا گئے اور پوچھا ''کیوں خیریت تو ہے؟''

میں نے آب دیدہ ہو کر کہا ''ہاں شکر ہے اللہ کا! وقت کی بات ہے، میں چوک گئی، اتنا کم بخت بھی ادھر چلی گئی۔ عرفان نے توتے سے کٹوا دیا، اتنا سارا جیتا جیتا خون نکل گیا۔ یہ بلک رہا تھا وہ ہنس رہا تھا۔ میں نہ آؤں تو ساری انگلی الگ ہو جائے.

سرکار کی حالت تو اتنا سنتے ہی کچھ سے کچھ ہو گئی وہ بغیر کپڑے اتارے باہر گئے اور عرفان کو خوب پیٹا بچے کی بساط ہی کیا۔ ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا اور سلمان کو گود میں لے کر بیٹھ گئے۔ اس وقت میں نہایت خوش، دل میں ہنستی، ظاہر میں ٹھنڈے سانس بھرتی باہر آئی۔ رات چاندنی تھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ ڈیوڑھی میں کھسر پسر کی آواز کان میں آئی۔ میرا قدم دھرنا تھا کہ احسان، عرفان کا بڑا بھائی جو اب دس برس کا تھا میری صورت دیکھتے ہی سہم گیا۔ اس کی گود میں عرفان کا سر تھا وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ ''یہ سو گیا'' جاگتا ہی نہیں، میں اس کو ابھی لے جاتا ہوں۔ احسان نے رو رو کر کچھ اس درد سے بھائی کی حالت بیان کی

کہ اس وقت میں لرز گئی۔ دیکھتی ہوں تو عرفان بے ہوش پڑا ہے۔ گھبرا کر گھر میں آئی۔ صندوق کھول کر عطر نکالا، ٹرنک منگوا کر کپڑے نکالے، لے کر آئی تو دونوں بچے جا چکے تھے۔ خاموش آ کر بیٹھ گئی۔ معاملے پر غور کیا تو بن ماں کا بچہ بے گناہ تھا۔ اس پر جو ظلم ٹوٹا وہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ان کی عبرت ناک تصویر اس کا میرے آگے ہاتھ جوڑنا، بلکنا اور رونا میرے کلیجہ کے پار ہو رہا تھا۔ دل نے اس وقت یہ صدا دی۔ ''اشرف زندگی کا اعتبار نہیں۔ اگر آج تیرا دم نکل جائے تو عرفان سے بدتر حالت سلمان کی ہوگی'' اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ سلمان کی یہی حالت کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی، برقعہ اوڑھ باہر نکل گئی۔ کوٹھی کے سامنے قبرستان تھا۔ چاندنی رات دو معصوم بچے ایک قبر پر نظر آئے۔ چھوٹا بے ہوش تھا اور بڑا اسکی صورت دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔ میں چپکی کھڑی ان کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً چھوٹا کسمسایا اور بڑے نے اس کے منہ پر منہ رکھ کہا۔ بھائی اُٹھ بیٹھ''۔

عرفان: ''بھائی میرے ہاتھ میں بڑا درد ہو رہا ہے ہاتھ نہیں اٹھتا۔

احسان: لا میں اپنا کُرتا اتار کر باندھ دوں، ہمارا ابھی تو اللہ ہے، اب ہم بڑے ہو جائیں گے تو آپ کمانے لگیں گے۔''

عرفان: اچھے بھائی خدا کے لئے میرا سر دبا دے بڑا درد ہو رہا ہے۔ میری اماں ہوتیں تو دبا دیتیں۔

احسان: ''اماں کے سامنے ابا مارتے ہی کیوں، اماں کے مرنے ہی سے تو ہماری مٹی ویران ہوئی۔ اس قبر میں اماں میری سو رہی ہیں۔ اماں جان ہم کو بھی اپنے کلیجے

سے لگا لو۔

اس وقت میری حالت بھی بگڑ چکی تھی۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی اور ظلم ناحق کی سزا دوزخ کے شعلے میرے رُوبہ رُو بھڑک رہے تھے۔ میں دونوں کو اٹھا کر گھر لائی، رات بھر ان کی خدمت کی صبح اُٹھتے ہی ڈاکٹر کو بلوایا۔ ہاتھ پر پٹی بندھوائی اور سچے دل سے خدا کے حضور میں توبہ کی۔ وہ دن اور آج کا دن، یہ تینوں اب جوان جوان میرے سامنے بیٹھے ہیں، ان میں رتی بھر فرق کیا ہو تو خدا کے ہاں دین دار ہوں''۔ پیارے بچو! احسان، عرفان، اس ظلم کی آج تم دونوں سے معافی مانگتی میری زندگی ختم ہو گئی اور اب میں اس جگہ جا رہی ہوں جہاں ہر فعل کی جزا اور ہر کام کی سزا بھگتنی ہے ایسا نہ ہو کہ تم مجھ پر اس ظلم کا دعویٰ کرو''

اب دونوں بچے اشرف جہاں بیگم کو لپٹے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ اماں جان! ہمیں تو وہ بات ایک خواب سا یاد ہے۔ ہاں یہ اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کی محبت نے حقیقی ماں کو بھلا دیا''۔

اب اشرف جہاں بیگم نے کہا'' پیارے بچو! ممکن ہے تم کو بھی میری طرح ایسے بچوں سے سابقہ پڑے مگر یاد رکھو کہ ان کے دُکھتے ہوئے دلوں کی آہ اچھی نہیں ہوتی جس طرح میں اپنے فعل پر نادم ہو کر آج خدا کی حضوری میں سُرخ رو جا رہی ہوں اسی طرح جانے کی کوشش کرنا اور وہ موت ایسی ہو گی جس پر ہزار زندگیاں قربان ہوں۔

معنی واشارے

پار اُتارنا	:	مار ڈالنا
سرکار	:	مراد شوہر
وقعت	:	عزّت
کانڑی	:	کانی، ایک آنکھ والی
گھڑکیاں	:	ڈانٹ ڈپٹ، جھڑکیاں
پٹخنیاں کھانا	:	زمین پر پیر مارنا
تللّی	:	دھار
لہولہان	:	خون میں لتھڑا ہوا
آپے سے باہر ہونا	:	غصّے میں بے خود ہو جانا
آنسوؤں کی جھڑیاں بہنا	:	لگا تار آنسو بہنا
بیری	:	بیر کا درخت
آب دیدہ ہوکر	:	آنکھوں میں آنسو بھر کر
چوک جانا	:	بھول جانا، غلطی کرنا
جیتا جیتا	:	تازہ تازہ
بساط	:	حیثیت
عبرت ناک	:	خوف دلانے والا

کسمسانا : پہلو بدلنا، بے چین ہونا

دین دار : مقروض، جواب دہ

سوالات:

I۔ (الف)

1) ماں کی وفات اور باپ کی دوسری شادی کے بعد ان دونوں بچوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کیسا رہا؟

2) جب توتے نے ننھے سلمان کی انگلی کاٹی تو سوتیلی ماں نے عرفان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟

3) باپ نے عرفان کو گھر سے کیوں نکال دیا؟

4) گھر سے نکال دیئے جانے کے بعد دونوں بچے کہاں گئے اور ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی؟

5) بچوں کو گھر سے نکال دینے کے بعد سوتیلی ماں نے جب معاملہ پر غور کیا تو اسے کیا محسوس ہوا اور اس نے اپنی غلطی کی تلافی کیسے کی؟

6) ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے۔

وقعت، بساط، عبرت ناک، کسمسانا، آپے سے باہر ہونا

حصہ (ب) بحوالہ متن تشریح کیجیے

1) سلمان کھانا کھا چکتا تو اس کے آگے کا بچا بچایا کھانا بھی اس کو دے دیتی، پرانی دھرانی جوتی، پھٹا پرانا کرتا اسی کے کام آتا۔

2) ہاں شکر ہے اللہ کا! وقت کی بات ہے میں چوک گئی، اتنا کم بخت بھی ادھر چلی گئی، عرفان نے توتے سے کٹوا دیا، اتنا سارا جیتا جیتا خون نکل گیا، یہ بلک رہا تھا وہ ہنس رہا تھا۔ میں نہ آؤں تو ساری انگلی الگ ہو جائے۔

3) اس ظلم کی آج تم دونوں سے معافی مانگتی میری زندگی ختم ہو گئی اور اب میں اس جگہ جا رہی ہوں جہاں ہر فعل کی جزا اور ہر کام کی سزا بھگتنی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم مجھ پر اس ظلم کا دعویٰ کرو۔

حصہ (ج)

1) سوتیلی ماں نے بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا تفصیل کے ساتھ لکھیے

2) ''سوتیلی ماں کا آخری وقت'' میں راشد الخیری نے جو کہانی پیش کی ہے، اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

اِنٹرنیٹ

ڈاکٹر وہاب قیصر

دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں شدّت کے ساتھ ایک ایسے مواصلاتی نظام کی ضرورت محسوس کی گئی جو ٹیلی فونی رابطہ کے ٹوٹ جانے پر بھی ربط قائم رکھنے میں مدد دے سکے۔ کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا جب کہ ایک ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالا گیا، جس میں مواصلاتی نظام کو ایک جال کی شکل میں قائم کیا جاتا ہے۔ اس جال کے ٹوٹ جانے پر بھی مواصلاتی مراکز کا آپسی رابطہ برقرار رہتا ہے۔ کمپیوٹروں کے ذریعہ قائم کیا گیا ترقی یافتہ مواصلاتی نظام کا یہ جال انٹرنٹ کہلاتا ہے۔

انٹرنٹ حقیقت میں مواصلاتی نظام کا ایک بہت بڑا کمپیوٹر نٹ ورک ہوتا ہے۔ جس میں ہزاروں چھوٹے اور کئی بڑے نٹ ورک شامل رہتے ہیں گویا کہ الکٹرانک جالوں کا ایک جال سارے برّاعظموں کو مواصلاتی لائنوں پر جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی بدولت کئی ملکوں کے لاکھوں افراد بہ راہ راست ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی شخص کے ساتھ منٹوں میں ربط قائم کیا جاسکتا ہے۔

انٹرنٹ کی ابتدائی سروس الکٹرانک میل ہے۔جس کو عام طور پر ای میل (E-Mail) کہا جاتا ہے۔شروع میں اس کو صرف تعلیمی سرگرمیوں، سرکاری امور اور صنعتی تحقیقات میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب یہ دنیا بھر میں ہر شخص کے استعمال میں ہے جس کا کمپیوٹر، انٹرنٹ سے جڑا ہوا ہے۔کسی بھی کمپیوٹر کو انٹرنٹ سے جوڑنے کیلئے ماڈیم (Modem) ٹیلی فون لائین اور انٹرنٹ سروس مہیا کرنے والے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ماڈیم ایک ایسا الکٹرانک آلہ ہے جو کسی کمپیوٹر کے تمام اعداد وشمار کو خاص اشاروں میں تبدیل کر کے ٹیلی فون لائین کے ذریعے ایک مخصوص رفتار کے ساتھ دوسری جگہ بھیج دیتا ہے۔اس کے علاوہ وہ ایسے اعداد وشمار کو حاصل بھی کرتا ہے جو مقامی کمپیوٹر کیلئے ترسیل کئے جاتے ہیں۔

ذیل کی شکل میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ دو مختلف مقامات کے کمپیوٹروں کو انٹرنٹ کے ذریعے کس طرح منسلک کیا جاتا ہے۔

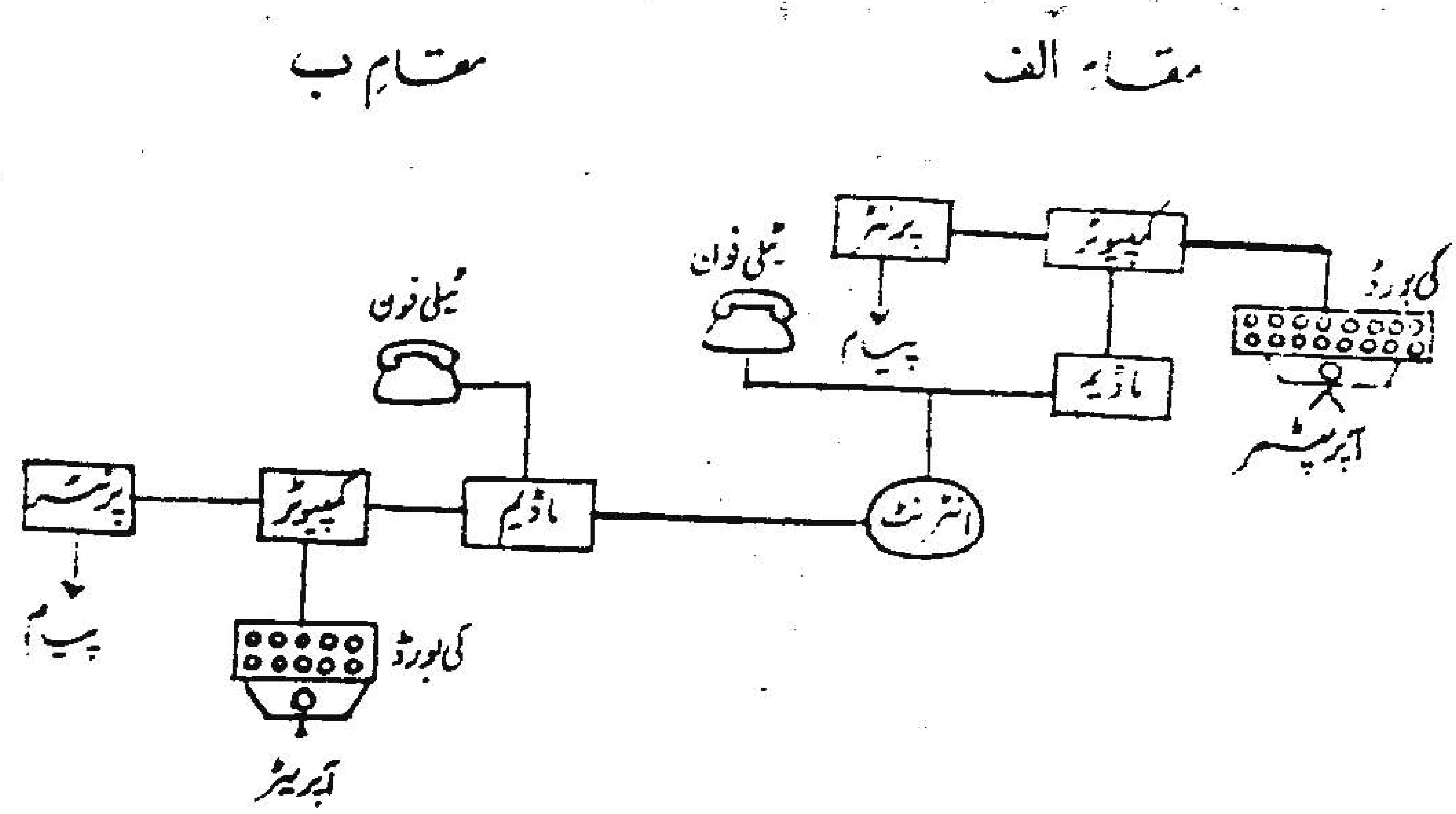

ای - میل (E-Mail):

الکٹرانک میل، انٹرنٹ کی ایک ایسی سہولت ہے جس کی مدد سے کوئی بھی شخص کسی بھی طرح کا پیام دنیا کے کسی بھی گوشے میں چند منٹوں میں بھیج سکتا ہے۔ پیامات کی ترسیل اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب دوسرے شخص کا ای میل پتہ معلوم ہو۔ ای میل کے ذریعہ بھیجا گیا، پیام بہت کم خرچ اور تیز رفتار ہوتا ہے، اس نظام کی خوبی یہ بھی ہے کہ اگر کسی ایسے شخص کو ای-میل کے ذریعے پیام بھیجنا ہو جس کے پاس ای-میل کی سہولت نہیں ہے لیکن اس کے پاس ٹیلکس یا فیکس مشین موجود ہے تب بھی ای-میل کے ذریعے ٹیلکس یا فیکس پر پیام بھیجا جاسکتا ہے، البتہ ٹیلکس یا فیکس مشین پر کسی کو ای-میل کے ذریعے پیام نہیں بھیجا جاسکتا۔

انٹرنٹ کے ذریعے اب تک جو سہولتیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں ورلڈ وائڈ ویب (www) فائل ٹرانسفر پروٹوکال (FTP) ٹیل نٹ (Telnet) یوزنٹ (use net) اور گوفر (Gopher) قابل ذکر ہیں۔ ذیل کی شکل میں انٹرنٹ کیلئے دستیاب مختلف سہولتوں کو واضح کیا گیا ہے۔

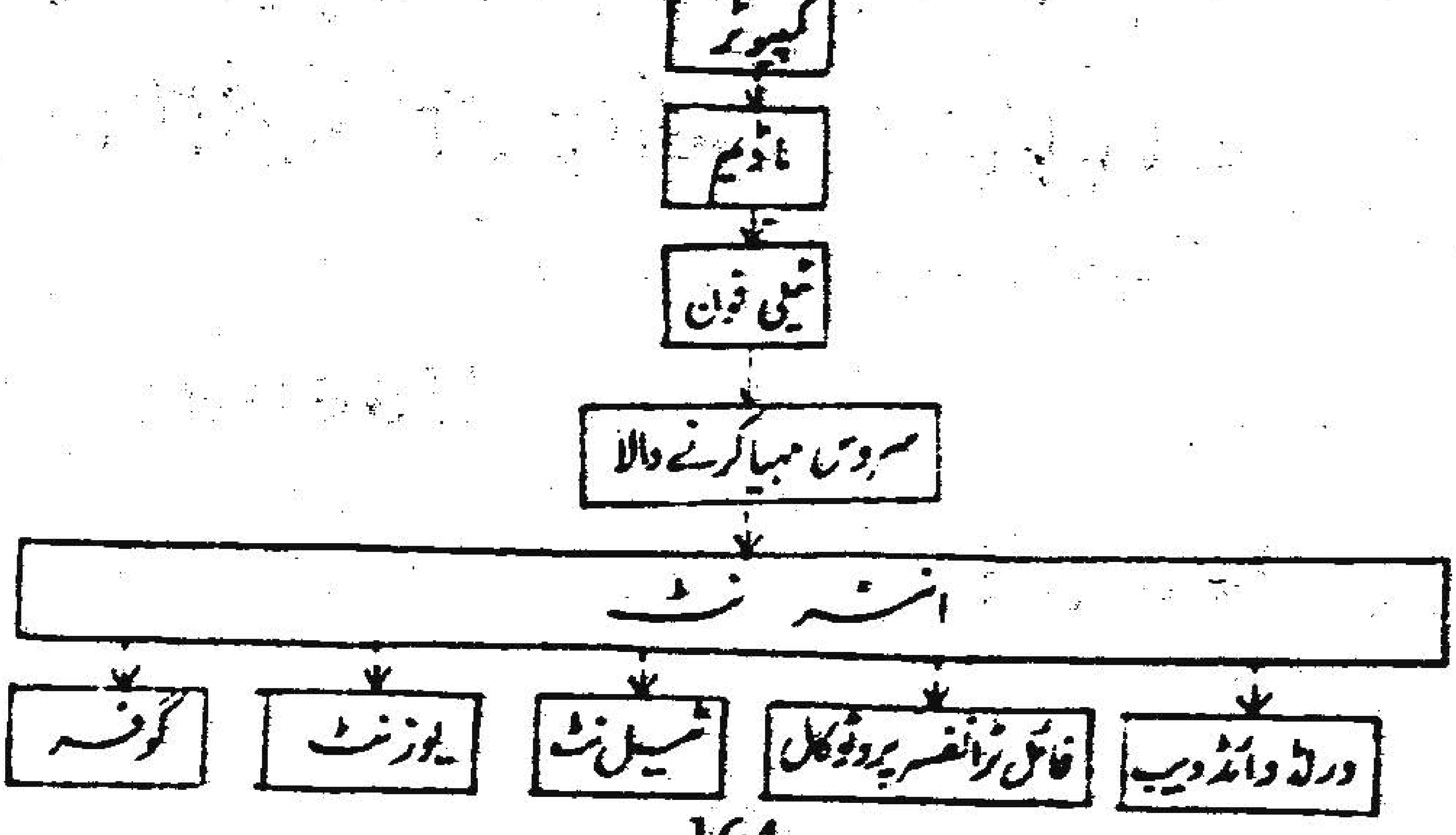

ورلڈوائڈویب (www):

ورلڈوائڈویب کوعام طور پر www سے ظاہر کیا جاتا ہے۔اس سہولت کی بدولت ہر شخص کی پہنچ انٹرنٹ تک ہونے لگی ہے. یہ ذرائع ابلاغ کی وہ سروس ہے جس کے ذریعے ترسیل کی سہولت کوایک نٹ ورک سے دوسرے نٹ ورک پر منتقل کیا جاسکتا ہے۔اسمیں تصاویر، آواز اور تحریری مواد کی ترسیل کی سہولت حاصل رہتی ہے۔کوئی بھی شخص ورلڈوائڈویب کواسی وقت استعمال کرسکتا ہے جب کہ اس کیلئے ویب سائٹ web sight حاصل ہوجائے۔

فائل ٹرانسفر پروٹوکال (FTP)

انٹرنٹ کی یہ ایک ایسی سہولت ہے جس میں کسی دور مقام کے کمپیوٹر میں محفوظ کسی اطلاع کی نقل حاصل کرلی جاتی ہے تاکہ اس کومقامی کمپیوٹر میں محفوظ کیا جاسکے۔

ٹیل نٹ (Telnet):

اس نٹ میں یہ سہولت رہتی ہے کہ کسی دور مقام پر موجود کمپیوٹر کو اسی طرح استعمال کیا جاسکتا جس طرح کہ مقامی کمپیوٹر کواستعمال کیا جاتا ہے۔

یوزنٹ (Usenet):

اس میں دنیا بھر کی اہم خبریں اوراطلاعات تیزی کیساتھ ترسیل کی جاتی ہیں۔

انٹرنٹ کی یہ سہولت بہت زیادہ شہرت پا چکی ہے۔

گوفر (Gopher):

انٹرنیٹ کی وہ سہولت جس میں سلسلہ وار درج شدہ فہرست میں سے مطلب کی اطلاع حاصل کی جاتی ہے۔

جب ہم انٹرنٹ کے ذریعے دستیاب سہولتوں کا احاطہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی مدد سے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے عزیزوں اور دوستوں سے بات چیت کی سہولت حاصل رہتی ہے۔ تازہ ترین خبروں سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے؟ عام معلومات میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ علم کے خزانوں سے آنِ واحد میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ تفریح طبع کے ذرائع فراہم ہوسکتے ہیں۔ فنی ماہرین اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی تشہیر کرسکتے ہیں۔ صنعتی پیداوار کنندگان اپنی پیداوار کو بین الاقوامی بازار میں پہنچاسکتے ہیں۔ بلکہ وہ اس بات کا پتہ بھی لگا سکتے ہیں کہ بین الاقوامی مارکٹ میں مخصوص صنعتی پیداوار سپلائی کرنے والی کون کون سی کمپنیاں موجود ہیں۔ دنیا بھر کے مختلف سرکاری نیم سرکاری اور خانگی ادارے باہمی طور پر تعلق اور اشتراک کا قیام عمل میں لاسکتے ہیں۔ غرض انٹرنٹ ایک ایسی ٹکنالوجی ہے جو مستقبل میں آنے والی نسلوں کی زندگیوں کو سنوارنے میں مدد گار ثابت ہوگی۔

I۔ معنی اور اشارے

براہ راست	=	سیدھا
مواصلاتی	=	حرکت، نقل و عمل
امور	=	امر کی جمع، حکم، بات
ترسیل	=	بھیجنا، روانہ کرنا
احاطہ کرنا	=	جائزہ لینا
ابلاغ	=	پہنچانا، بھیجنا
منسلک	=	جڑا ہوا
استفادہ	=	فائدہ حاصل کرنا
باہمی	=	ایک دوسرے کے ساتھ، آپسی
تشہیر کرنا	=	مشہور کرنا
اشتراک	=	شرکت کرنا، شریک ہونا

II۔ ذیل کے سوالوں کے جوابات لکھیے

1) انٹرنٹ سے کیا مراد ہے؟

2) انٹرنٹ کی ضرورت کب اور کیوں محسوس کی گئی؟

3) انٹرنٹ کو جوڑنے کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

4) دو مختلف مقامات کے کمپیوٹروں کو انٹرنٹ کے ذریعہ کس طرح جوڑا جاتا ہے

5) ای-میل سے کیا مراد ہے؟

6) شکل کے ذریعہ انٹرنٹ کی مختلف سہولتوں کو واضح کیجیے

7) انٹرنٹ سے کیا فائدے ہیں؟ تفصیل سے لکھیے

8) ماڈیم سے کیا مراد ہے؟

III- مندرجہ ذیل اقتباسات کی بحوالہ متن تشریح کیجیے

1) اس کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی شخص کے ساتھ منٹوں میں رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے؟

2) انٹرنٹ کی یہ ایک ایسی سہولت ہے جس میں کسی دور مقام کے کمپیوٹر میں محفوظ کسی اطلاع کی نقل حاصل کر لی جاتی ہے، تا کہ اس کو مقامی کمپیوٹر میں محفوظ کیا جا سکے۔

3) دنیا بھر کے مختلف سرکاری نیم سرکاری اور خانگی ادارے باہمی طور پر تعلق اور اشتراک کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں۔

IV ان سوالوں کے جواب لکھیے

1) انٹرنٹ سے حاصل ہونے والی مختلف سہولتوں کو تفصیل سے لکھیے

2) ''سائنس کی نئی ایجادات'' کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھیے۔

خوابوں کی رہنمائی میں

ڈاکٹر پروین فاطمہ

ڈاکٹر پروین فاطمہ کی ولادت 17/ مارچ 1957ء میں شہر مدراس کے والا جاہی خاندان میں ہوئی۔ علم کیمیا میں بی۔ ایس۔ سی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اردو زبان وادب سے فطری لگاؤ کے باعث مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم۔ اے۔ ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں، پچھلے سولہ سال سے سرکاری شعبہ تعلیم سے وابستہ رہی ہیں اور اب کوئین میریس کالج چینئی میں بحیثیت سینئر لکچرار اور صدر شعبۂ اردو اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ محقق ونقاد ہیں۔ شعر گوئی کا ملکہ بھی حاصل ہے۔ اب تک ان کی تین تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

1) والا جاہی خاندان کے تین شاعر پرتو، شاکر اور ایمان
2) صحافت، فنی وارتقائی سفر
3) جواز فکر (مجموعۂ مضامین)

خدائے تعالیٰ نے انسان کو جو عظیم طاقت اور وسیع حکمت عملی عطا کی ہے۔ اس کی تہہ میں یہ لطیف عنصر پوشیدہ ہے جسے ہم خواب یا تصور کا نام دیتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی کام یوں ہی وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ کسی فرد کی خواہش اور اسکے تخیل کی خامہ فرسائی اسے بلند حوصلے عطا کرتی ہے۔ اور اگر اس کی خواہش و تمنا میں عملی جدو جہد اور خدمت و خلوص کا جذبہ کار فرما ہو تو اس فرد کے ہاتھوں حیرت انگیز اور قابل فخر کارنامے انجام پاتے ہیں۔

نپولین ہلِ نے اپنی تصنیف (The law of Success) میں ایک واقعہ پیش کیا ہے جو مندرجہ بالا خیال کی صداقت کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

وہ لکھتا ہے آج سے تقریباً تیس سال پہلے امریکہ کے ایک نوجوان پادری گنسالس (Gun Saulus) نے اخبار میں ایک اشتہار دیا تھا کہ چرچ میں اگلی اتوار کی صبح جس عنوان پر اس کی تقریر ہوگی وہ ہے ''اگر میرے پاس ایک ملین ڈالر ہوتے تو میں کیا کرتا'' اس اشتہار پر امریکہ کے ایک بہت بڑے رئیس فلپ ڈی آرمر کی نظر پڑی اور اس نے یہ لکچر سننے کی ٹھانی۔

اپنی تقریر میں ڈاکٹر گنسالس نے ٹکنالوجی کے ایک ایسے عظیم اسکول کی تصویر کشی کی جس میں نوجوان طلباء و طالبات کے شعور کو اس قدر بالیدہ کیا جاتا ہے کہ وہ محض اصولی طریقہ کار کی بجائے عملی طور پر غور فکر کریں اور اس سلسلے میں انہیں پوری ترتیب اور تمام سہولیات فراہم کی جائیں۔ گویا تعلیم بذریعۂ عمل ہو۔ اسکول کا پورا

نقشہ کھینچنے کے بعد اس نے اختتاماً کہا۔

''اگر میرے پاس ایک ملین ڈالر ہوتے تو میں ایک ایسا اسکول قائم کرتا''۔

جیسے ہی اس نوجوان پادری نے اپنے کلمات ختم کیے۔ فلپ ڈی آرمر کے تیز قدم اس پادری کی جانب بڑھے۔ وہ اس کے قریب گیا اپنا تعارف پیش کیا اور کچھ ہی دیر میں اس امیرِ زمانہ کی آواز چرچ کے اندر گونجنے لگی۔

''نوجوان مجھے تمہارے خلوص و جذبہ نے بے حد متاثر کیا
مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے
اس پر ضرور عمل کر کے دکھاؤ گے اگر کل تم میری آفس آنے کی
زحمت کرو گے تو وہ ایک ملین ڈالر جس کی تمہیں ضرورت ہے
ضرور مل جائیں گے''۔

جب کسی کے پاس کچھ کرنے کی سچی لگن اور عملی منصوبہ ہو تو سرمائے کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ پادری کی پر خلوص کوشش اور آرمر کے سرمائے کی بنا پر امریکہ کے ایک عظیم ادارے ''آرمر انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی'' کا قیام عمل میں آیا۔ گویا اس قوم کے ایک نوجوان کے پر خلوص تصور اور عملی قدم سے ٹیکنالوجی کے ایک ایسے ادارے کی بنیاد پڑی جس نے کروڑوں نوجوانوں کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ ان کی قسمت سنواری اور دیس کا نام دنیا بھر میں اونچا کیا۔ اگر وہ قوم کی ترقی کا تصور نہ کرتا تو ایک محدود دائرے ہی میں رہتا۔ اس کے تصور اور آرمر کے سرمائے نے قوم کی ترقی کا

بیڑا اٹھایا۔

دنیا میں جتنی بھی ترقیاں ہوئی ہیں ان پر ذرا نظر ڈالئے سائنس اور ٹکنالوجی، تجارت اور دیگر تمام میدانوں میں ہونے والی ایجادات کی عمارتیں محض فرد واحد کے تصور اور اسکے خوابوں کی مستحکم بنیاد پر کھڑی ہوئی ملیں گی۔ تھامس الوا اڈیسن نے بولنے والے مشین، چلنے پھرنے والی تصویریں اور الکٹرک بلب وغیرہ یوں ہی نہیں بنادئے تھے۔ یہ اس کے تصور اور خوابوں کی کاریگری وکارفرمائی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں حیرت انگیز ایجادات ہوئیں۔

ہماری قدیم کہانیوں اور داستانوں میں جو تعجب خیز باتیں لوگ برسوں سنتے اور پڑھتے آئے ہیں وہ ہیں اڑنے والے گھوڑے یا اڑن کھٹولے، تصویروں کا بولنا، مورتیوں کا حرکت میں آنا، کسی انسان کی جان کا طوطے کی جان سے منسلک ہونا (کہ ادھر طوطے کی گردن مروڑو تو اُدھر آدمی کی جان ختم) جام جم جس میں دنیا نظر آتی ہے، جنّات کا کافی دور کے فاصلے سے چراغ کا جلانا یا بجھانا، نہ جانے ایسی کتنی باتیں اور کرشمہ سازیاں ان داستانوں میں دکھائی گئی ہیں جنہیں سن کر اور پڑھ کر انسان متعجب ہوا کرتے تھے اور جو انہیں ذہنی انبساط اور سرور مہیا کرتی تھیں۔ یہ ساری باتیں انسانی تخیل کی دین تھیں۔ انسان کے اسی تخیل نے ایک مدت کے بعد ان ساری تصوراتی اور خیالی تصاویر کو حقیقت کا جامہ پہنادیا اور آج ایروپلین، ہیلی کوپٹر، ریڈیو، ٹیلی فون، سنیما، ٹیلی ویژن، روبوٹ، کمپیوٹر، ریموٹ کنٹرول، انٹرنیٹ وغیرہ ہمارے لئے باعث تعجب نہیں بلکہ ضرورت استعمال کی اشیاء بن کر رہ گئی ہیں!

تصور یا تخیل انسانی ذہن کی دین ہے، جس کی نشو ونما اور تربیت ممکنات میں سے ہے۔ یہ عمل اس وقت کارنامے کا روپ دھار لیتا ہے جب تصور میں جذبہ، خلوص، عزم اور عملی جدوجہد شامل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ عوامل تھے جن کی بدولت قوم کے رہنما اور ملت کے رہبران اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے میں کامیاب ہوئے۔

خواب یا تصور کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ہمیں سب سے پہلے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ہم جیسے بھی ہیں اور جہاں بھی ہیں خود کو کسی کام کے لائق بنائیں اور اپنے تصورات کا استعمال کرتے ہوئے خود کو کارآمد ہستی کے روپ میں پیش کریں۔ بلاشبہ جوان ہو یا بوڑھے، مرد ہو کہ عورت ہر انسان میں اتنے گر تو ضرور ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے طور پر کوئی نہ کوئی کام انجام دے سکیں۔ اور اپنے وجود کو قابل ناز بنا سکیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم اس بات کی عادت ڈالیں کہ اپنے معاوضے سے بڑھ کر کام کریں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اتنا زیادہ کام کیوں کریں جب کہ انہیں معقول معاوضہ نہیں ملتا۔ ایسی سوچ آدمی کو کمزور اور نکما بنا دیتی ہے۔ جب ہم اپنا کام بہتر طور پر انجام دیں گے اور اپنے سرپرست کو مطمئن رکھ سکیں گے۔ تو ترقی کی راہیں ہمارے لئے بہ آسانی کھل جائیں گی۔ بہر حال محنت کی عادت ہمیں اونچائیوں اور ترقیوں کی طرف لے جانے کی ضمانت دیتی ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے موقعہ کی تلاش میں آپ دور کیوں جایئے گا۔ موقعہ آپ کے سامنے ہے آپ

اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سونے کی کان آپ کے قدموں کے تلے ہے۔

کامیابی کی راہوں میں جن باتوں کی ضرورت ہے ان میں سے چند ایک کے بارے میں تو ہم جان چکے ہیں چلیئے اب ان باتوں کی طرف دھیان دیں جوان راہوں میں رکاوٹیں کھڑی کرسکتی ہیں۔ پہلے انہیں جڑ سے ختم کرنا ہے۔ یہ رکاوٹیں کوئی بیرونی طاقتیں نہیں بلکہ اپنے اندر کی کمزوریاں ہیں جو کامرانی کی راہوں میں حائل ہوا کرتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کمزوری ہے ''تعصب'' جو رواداری کی صفت کو زائل کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کمزوریاں ہیں ۲) لالچ ۳) حسد ۴) شک ۵) انتقام ۶) انانیت یا خود پسندی ۷) تکبر ۸) اس فصل پر قابض ہونا جسے اس نے نہیں بویا اور ۹) آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرنا۔

مندرجہ بالا خصائل تمام انسانوں کے مشترک دشمنان ہیں جب تک انسان ان کمزوریوں سے چھٹکارا نہیں پائے گا۔ وہ کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھ نہیں پائے گا۔ اپنی غلطیوں کی ذمہ داری دوسروں پر عائد کرنے کے بجائے خود کو ان کا ذمہ دار ٹھہرانا اور اس بات کا علانیہ اظہار کرنا اس انسان کو اوروں کی نظر میں اونچا کرتا ہے۔ اور وہ شخص قوم اور سماج کی نظر میں قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔

ہر انسان کی زندگی کا ایک مقصد ہونا چاہیئے ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہم کیا کچھ کرسکتے ہیں؟ اس کا فیصلہ کوئی دوسرا شخص نہیں ہم کرسکتے ہیں، کیونکہ یہ بات تو صرف ہمارے دل و دماغ میں ہمارے تصور اور خوابوں میں چھپی ہوتی ہے۔

اس مقصد کو حرکت و عمل میں لانے کیلئے سب سے پہلے ہمیں ایماء نفسی

(Self Suggestion) سے کام لینا پڑے گا۔ انسان کا دماغ ایک ایسی مشین ہے کہ اسمیں جیسا سانچہ ڈالو گے ویسی ہی چیزیں بن کر باہر نکلیں گی۔ یعنی یہ کہ جیسا تصور ہوگا ویسا ہی عمل ہم سے سرزد ہوگا۔

انسان جب اپنی ترقی وکامرانی کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ کامیابی کے زینے تک پہنچ گیا۔ جب وہ تصور کرنا یا خواب دیکھنا چھوڑ دیتا ہے۔ تو وہ لکیر کا فقیر بن کر رہ جاتا ہے سڑکوں پر مونگ پھلی، بیچنے والے کی مثال لیجئے وہ ساری زندگی اسی کام میں گزار دیتا ہے اس لئے کہ اس نے کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا بہتر زندگی گزارنے اور بہتر کام کر دکھانے کا تصور نہیں کیا۔ اگر وہ اپنے ذہن کی تہیں ٹٹولتا اور مناسب تربیت پاتا تو اپنے کاروبار کو مزید بڑھاتا اور مقصد حیات کو پالیتا، جو محنت وہ اب کر رہا ہے محض اتنی ہی محنت بہتر تصور اور مناسب تربیت ذہنی کی بدولت اسے بہتر مقام پر لے جاسکتی تھی۔

انسان کی زندگی میں کوئی خاص مقصد نہ ہو تو اس کی تمام تر توانائی مختلف سمتوں میں منتشر ہو جاتی ہے وہ تذبذب میں مبتلا رہتا ہے۔ اور خود کو کمزور اور پست ہمت محسوس کرنے لگتا ہے۔

قومیں اپنی نسلوں کے تصورات اور ان کی ان تھک کوششوں سے بنتی ہیں۔ ایک نسل اپنی کوششوں کے پھل دوسری نسل تک پہنچاتی ہے۔ اور یہ عمل مسلسل چلتا رہتا ہے۔ تصور نہ ہو تو روشنی مفقود، راہیں مسدود، ہاتھ پاؤں شل اور غیر موجود محسوس ہوتے ہیں۔ خواب اور تصور کے بغیر انسان کی زندگی کی مثال اس جہاز سے

دی جا سکتی ہے جو بغیر کسی مقصد کے سمتوں سے بے خبر بیچ سمندر میں موجود ہے۔

اقبالؔ نے بھی قوموں کی بقا کیلئے تصور اور تخیل کو اہم قرار دیا ہے۔ دور جدید کے اس قابل فخر سائینسدان جنہوں نے ملک کو میزائل ٹکنالوجی پروگرام سے نوازا ہے۔ دنیا کے چند گنے چنے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں ہندوستان کے شامل ہونے کا خواب دیکھا ہے۔

اپنے پاس خواب کو حقیقت میں بدلنے کیلئے وہ جس مشترکہ کوشش اور سعی کی مانگ کرتے ہیں وہ ہے اس ملک کی ٹکنالوجی کی طاقت جو خوش حال ہندوستان کی چابی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 2020ء کے بعد ترقی کا عمل رک نہیں جائے گا بلکہ یہ تو آگے بڑھتا ہی رہے گا اس لئے کہ حرکت وعمل اور ترقی وکامیابی ہی زندگی کی پہچان ہے۔ چنانچہ بدلتی اور ترقی پذیر دنیا میں ہر فرد اور ہر ملک کا جدوجہد میں رہنا ناگزیر ہے اور عمل اور جدوجہد کی راہ دکھاتے ہیں ہمارے خواب اور ہمارے تصورات۔

سوالات حصّہ (الف)

1) اس مضمون کی روشنی میں بتائیے کہ خدا نے انسان کو وہ کونسی لطیف قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے وہ کارنامے انجام دیتا ہے۔

2) کنسالس نے ٹکنالوجی کے اسکول کی تصویر کشی کن الفاظ میں کی ؟

3) خواب یا تصور کارنامے کا روپ کیونکر دھار لیتا ہے؟

4) وہ کونسی کمزوریاں ہیں جو کامرانی کی راہوں میں حائل ہوا کرتی ہیں؟

5) ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے اور الفاظ کے جملے بنایئے

ایماء نفسی، ناگزیر، جدوجہد، تخیل، خلوص

حصّہ (ب) بحوالہ متن تشریح کیجئے:

1) نوجوان مجھے تمہارے خلوص و جذبہ نے بے حد متاثر کیا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے اس پر ضرور عمل کر کے دکھاؤ گے۔

2) انسان کے اسی تخیل نے ایک عرصہ کے بعد ساری تصوراتی اور خیالی تصاویر کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

مہاتما گاندھی کی اَن مٹ یادیں

صالحہ عابد حسین

صالحہ عابد حسین کی پیدائش 1913ء میں بمقام پانی پت ہوئی۔ بنیادی طور پر وہ ایک افسانہ نگار ہیں۔ان کے کئی افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کئی اچھے ناول بھی اردو کو دیے۔ان کے علاوہ صالحہ عابد حسین نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔وہ ادب کو زندگی کا عکاس وترجمان سمجھتی ہیں،ان کی تحریروں میں دلکشی، تازگی اور شگفتگی بہت ہے، زبان پاکیزہ و مستند، انداز بیان سادہ اور دلچسپ ہوتا ہے۔ مطلب کو اختصار اور صفائی کے ساتھ بیان کرنے کی خاص صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔سماجی معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی میں ان کا قلم اپنی جولانیاں دکھاتا ہے۔اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔اردو ادب میں جن خواتین نے اپنے اسلوب اور طرز بیان کی بدولت ایک علاحدہ شناخت قائم کی ہے ان میں صالحہ عابد حسین بھی شامل ہیں۔

اونچے پہاڑوں کی سر بفلک چوٹیوں کو قریب سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان کو کافی فاصلے ہی سے اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ بعض شخصیتیں بھی ایسی عظیم ہوتی ہیں جن کے رتبے اور کارناموں کو پوری طرح پہچاننے کے لئے وقت کے فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے سب سے بڑے رہنما، محسن، ہندوستان کی آزادی کے دیوتا مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی ایسی ہے جو زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ عظیم ہوتی جاتی ہے۔ افسوس ہمارے حال پر کہ ہم ان کی بڑائی کو پوری طرح پہچان نہ پائے اور ہماری قوم اور ملک نے جیسی چاہئے تھی، ان کی پیروی نہ کی۔ شاید اس کی یہی وجہ ہو کہ ہم نے ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھا ہے اس لئے ان کی عظمت اور ان کی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ نہ پائے۔ یا پھر دو سو سال کی غلامی کا جو زہر رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا وہ ابھی پوری طرح خارج نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن مہاتما گاندھی کے کام ان مٹ، ان کا پیام امر اور ان کی سیرت ایسی دلکش ہے جو کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

دنیا میں جتنی عظیم ہستیاں گزری ہیں، جہاں تک ان کے حالات معلوم ہو سکے ہیں یہی پتہ چلتا ہے، وہ سیدھے سادے عام قسم کے نیک شریف انسان تھے۔ ہاں ان میں کچھ ایسی صفات ضرور ہوتی تھیں جو لوگوں کے دلوں کو موہ لیا کرتی ہیں۔ حق کی تلاش انسانی ہمدردی اور سچائی کی راہ پر چلنے کا گہرا جذبہ، ان صفات میں سب سے نمایاں اور سب میں مشترک دکھائی دیتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی، شخصیت، کام اور پیام میں آپ کو یہ تینوں صفات سب سے نمایاں نظر آئیں گی۔ ساتھ ہی ان کی

سیدھی سادی معصوم سی شخصیت میں اس بلا کی کشش ان کی بھولے بھولے انداز کی باتوں میں ایسا درد و اثر اور ان کی آنکھوں میں پریم کی۔ عالمگیر پریم کی کچھ ایسی جوت تھی جو ہر کسی کا دل موہ لیتی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں آج کے زمانے کے لوگ کم ہی یہ بات جانتے ہیں کہ اس کے قائم کرنے اور اس کی بقا میں گاندھی جی کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ 1920ء میں جب ترکِ موالات کی تحریک زور پر تھی اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آزادی حاصل کرنے کا جذبہ بہت شدت سے ابھر آیا تھا، اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جس کو بدیسی حکومت کی امداد ملتی تھی (جس طرح اور ساری یونیورسٹیوں کو ملتی تھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی وغیرہ کے ساتھ مہاتما گاندھی بھی وہاں تشریف لے گئے تاکہ اسے آمادہ کریں کہ وہ بدیسی حکومت سے مدد لینا بند کردے۔ اس وقت کے اربابِ اقتدار کو وہ اس پر تو آمادہ نہ کرسکے مگر اس یونیورسٹی سے سرفروش مجاہدوں کی ایک جماعت نکل آئی جنھوں نے بدیسی اثرات سے آزاد ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ وہاں گاندھی جی نے کسی جلسے میں فرمایا تھا۔ ’’ہندوستان کو اگر پانچ فقیر مل جائیں تو اس کا بیڑا پار ہو جائے‘‘۔ جامعہ ملیہ کی شروع کی پچیس سال کی زندگی میں مہاتما گاندی کو کتنے ہی ایسے فقیر نظر آئے جنھوں نے اپنا سب کچھ جامعہ کی اور اس کے ذریعہ یا اس کے ساتھ ساتھ، قوم اور دیس کی خدمت میں نچھاور کردیا۔ بڑے سے بڑا لالچ اور کٹھن سے کٹھن وقت بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کرسکا۔ انھوں نے

ہر طرح کے دکھ جھیلے مگر قوم کی خدمت اور دیس کی وفاداری اور جاں نثاری سے منہ نہیں موڑا۔ اسی لئے گاندھی جی کو اس ادارے سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ جامعہ کو اپنا گھر کہا کرتے تھے اور جامعہ والوں کو اپنے خاندان کے افراد کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو آزادی کی سچی لگن رکھنے والا، اور ہندو مسلم اتحاد کا مرکز بھی سمجھتے تھے اور نشان بھی۔ اس کی بقا کی انہیں خود جامعہ والوں سے کم فکر نہ تھی۔ جب بھی جامعہ پر کوئی سخت وقت پڑا۔ اور کب کب نہیں پڑا۔ گاندھی جی ہمیشہ اس کا سہارا بنے۔ انھوں نے اس کے کارکنوں کا حوصلہ بڑھایا، مصیبتوں میں ساتھ دیا، کٹھنائیوں اور مفلسی میں مالی وسائل فراہم کیے۔ 1925ء میں جامعہ کی زندگی میں بڑا سخت وقت آیا تھا۔ جب اس کی زندگی ہی معرض بحث تھی چند نوجوان جاں باز مجاہدوں نے اس وقت اپنی زندگی جامعہ کے لئے وقف کرنے کا اعلان کر کے اس کی بے جان رگوں میں زندگی کی روح پھونک دی اور گاندھی جی نے کسی دل والے سے پچیس ہزار کی خطیر رقم دلوا کر اس کو زندہ رہنے کا وسیلہ فراہم کر دیا۔ یہ بیش بہا رقم اس وقت اس سے کہیں زیادہ اہم تھی جتنی آج کے زمانے میں پچیس لاکھ بھی نہیں ہو سکتی۔

جامعہ کی تعلیم، یہاں کا رہن سہن، یہاں کی بے تعصب، ذہنی طور پر صحت مند اور بے ریا فضا انھیں بہت پسند تھی اور سادگی اور جفاکشی جو خود ان کی زندگی کا بڑا اہم جزو تھی، وہ انھیں شاید اور ہر تعلیمی ادارے سے زیادہ یہاں نظر آتی تھی۔ دیوداس جی، مہاتما جی کے چھوٹے صاحبزادے ایک عرصے تک یہاں آ کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے پوتے رسک لال کو یہاں داخل کرایا تھا کہ وہ یہاں رہ کر تعلیم و تربیت

پائے، اور خاص کر اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھ سکے اور صحیح معلومات حاصل کر سکے۔ اس لڑکے کا کچھ عرصے بعد جامعہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد گاندھی جی یہاں تشریف لائے تو دل پر کتنا سخت اثر ہوگا؟ مگر بڑے انسانوں کی ایک یہ پہچان بھی ہے کہ وہ رضائے الٰہی پر راضی رہتے ہیں اور صبر شکر کے ساتھ ہر غم کو سہارتے ہیں۔ یہی نہیں ان کے دل میں اور زیادہ نرمی اور گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سخت صدمے کی حالت میں گاندھی جی نے کہا تو یہ کہا..

''جامعہ کا ہر بچہ میرا بچہ ہے'' اور

''اب تو جامعہ پر میرا حق اور زیادہ ہو گیا ہے''

جامعہ کے لوگوں نے جامعہ اور قوم اور دیس کی خدمت میں جس طرح جانیں کھپائیں، ایثار، تیاگ اور تپسیا کی جو کٹھن زندگی بتائی، اس میں گاندھی جی کی شخصیت اور سیرت کا کتنا اثر ہوگا یہ کون بتا سکتا ہے؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دل کی آنکھ کے سامنے ایک سادگی کا مرقع، ایثار، تیاگ اور قربانی کا جیتا جاگتا مجسمہ رہتا تھا۔

جامعہ کے بچوں تک کو گاندھی جی سے صرف عقیدت ہی نہیں بڑا پیار بھی تھا۔ 1944ء میں جامعہ کے یوم تاسیس (سالگرہ) پر بچوں نے ایک ڈرامہ کھیلا ''جامعہ کی ابتدائی زندگی'' اس ڈرامے میں جامعہ کے قیام اور ابتدائی زندگی کی کہانی دکھائی گئی تھی جس میں مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے کردار بھی تھے۔ سب سے مشکل کام گاندھی جی کا کردار نبھانا تھا۔ مگر

یہ مشکل کام جامعہ کے ایک نوعمر طالب علم محمد اقبال نے اس خوبی سے ادا کیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ جب وہ سر منڈائے، گاندھی جی کا سا حلیہ بنائے، ان کی سی دھوتی پہنے، عینک لگائے، لکڑی لئے اسٹیج پر آیا تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بات کرنے کے انداز تک کی اس خوبی سے نقل کی گئی تھی کہ سب واہ واہ کر اٹھے۔

یاد نہیں رہا کہ 1946ء تھا یا 1947ء، جب اوکھلہ اسٹیشن کے قریب کستور با بالکا آشرم میں جلسہ ہوا جس میں گاندھی جی تشریف لائے تھے۔ جامعہ کے لوگ بھی مدعو تھے بہت سے استاد حضرات، بہت سے بچے اور کچھ خواتین جامعہ، سب اس جلسے میں شرکت کرنے کے لئے پہنچے۔ جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جلسہ ختم ہوتے ہی لوگوں نے مہاتما جی کو گھیر لیا۔ جامعہ کے لوگوں کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ کتنے ہی قریبی تعلقات ہوں مگر بڑے آدمیوں سے پبلک جلسوں میں گھس پل کر نہیں ملتے تھے۔ مہاتما جی لوگوں سے ملتے جلتے رہے اور جامعہ کے استاد چپکے سے نکل کر اپنی بستی چلے آئے۔ مگر بچوں کا دل کیسے مانتا کہ اپنے باپو سے ملے بغیر چلے جائیں۔ کچھ بچے مجمع میں گھس پل کر گاندھی جی تک پہنچے۔ گاندھی جی مخصوص شفقت بھرے انداز سے بچوں سے باتیں کرنے لگے۔ سفید کھدر کی ٹوپی لگائے کھدر ہی کہ سفید اچکن پہنے ایک چھوٹے سے بچے نے بڑے لاڈ، بڑی اپنائیت اور کچھ شکایت کے انداز سے کہا: ''باپو آپ ہمارے ہاں نہیں آتے؟'' باپو کا چہرہ دم بھر کو گمبھیر ہوا ہوگا پھر اک دم مسکرا پڑے'' چلو بھئی ابھی چلتا ہوں۔ لے چلو مجھے۔'' اور بچوں کے جھرمٹ میں، دو کا ہاتھ پکڑے گاندھی جی جامعہ کی طرف چل پڑے۔ رات کا وقت، بالکل

آشرم سے لگ بھگ ایک میل کا فاصلہ، مگر اس کی انھیں کیا پرواتھی۔ کچھ بڑی عمر کے لڑکے گھبرائے کہ جامعہ میں کسی کو پتہ بھی نہیں ہے کہ گاندھی جی آرہے ہیں، کیسے ان کا استقبال ہوگا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ الجامعہ (موجودہ صدر جمہوریہ ہند) تک کے پاس موٹر کار نہ تھی اور سبھی لوگ بے تکلف میلوں پیدل گھوما کرتے تھے۔ احساس کمتری کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کو اس طرح پیدل چلنے میں وہ فخر اور شان محسوس ہوتی جو آج موٹر میں گھومنے والے جامعی بھی نہیں محسوس کر سکتے۔ خیر تو میں بتا رہی تھی کہ کچھ بڑی عمر کے لڑکے گھبرائے کہ کیسے باپو کا سواگت ہوگا۔ مگر بچوں کو اس کی فکر نہ تھی۔ وہ تو ان کا ہاتھ تھامے انھیں اپنے ...... اور ان کے۔ گھر لا رہے تھے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ گاندھی جی سے آگے بڑھنا بے ادبی تھا مگر بڑے لڑکے راستہ کاٹ کر بھاگتے ہوئے جامعہ کی مرکزی عمارت میں پہنچے۔ وہاں مقیم اساتذہ کو صورتِ حال بتائی، جلدی جلدی مدرسۂ ثانوی کے لان میں دری بچھائی اور گاؤ تکیہ رکھ دیا۔ بجلی تو تھی نہیں لال ٹینوں وغیرہ کی روشنی کی۔ دو ایک لڑکے ڈاکٹر ذاکر حسین و ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کے پاس دوڑے گئے۔ ہم سب لوگ جوش اور محبت میں کھانا وانا چھوڑ جلدی جلدی جامعہ کی طرف لپکے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گاندھی جی دری اور چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیے کے سہارے شمع محفل بنے بیٹھے ہیں۔ چہرے پر وہ مسکراہٹ ہے جو سچی مسرت کے وقت نظر آتی ہے۔ اور پروانوں کی طرح ان کے ہر طرف بچوں کا ہجوم ہے۔ یہ لوگ بھی اس شمع نور کے پروانوں میں شریک ہوگئے۔ ان کو دیکھ کر گاندھی جی ہنسے۔

''دیکھو یہ بچے مجھے پکڑ لائے آج تو میں انھیں کا مہمان ہوں'' بچے طرح طرح کے سوالات کرر ہے تھے اور گاندھی جی بڑے پیار سے جواب دے رہے تھے۔ یکا یک ایک بچے نے پوچھا: ''باپو آج کل دیس میں بڑے جھگڑے فساد ہو رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو اس وقت کیا کرنا چاہئے، یہ سوال سن کر گاندھی جی بہت متاثر ہوئے، بولے! ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے یہ پتے کی بات پوچھی'' اس کے بعد دیر تک لڑکوں کو ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت اور ایکتا کی ضرورت سمجھاتے رہے۔ مجھے گاندھی جی کے بالکل صحیح الفاظ تو یاد نہیں لیکن انھوں نے کہا وہی تھا جو اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کے سب لوگ، جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی سب شامل ہیں، سچی دوستی اور گہری محبت کے ساتھ بالکل ایک بن کر رہیں۔ تم میں سے ہر ایک کا یہ فرض ہے...... آج بھی اور آئندہ بھی۔ کہ اپنے بس بھر ایکتا اور اتحاد کے لئے کام کرے۔ نفرت، دشمنی اور بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دے اور سب کے ساتھ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہے اور مظلوم کی حمایت کے لئے اگر اپنی جان بھی دینی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ یہ دراصل ان کا محبوب موضوع تھا جن پر ان کی متعدد تقریریں اور بیانات وغیرہ کتابوں اور رسالوں میں ملتے ہیں۔

دس بجے رات تک گاندھی جی ان بچوں میں بالکل ایک بن کر ہنستے بولتے رہے، نصیحتیں کرتے رہے، ان کی باتیں سنتے اور خوش ہوتے رہے۔ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس وقت وہ یہ تو نہ جانتے تھے کہ ہندوستان کیا دنیا کے سب سے

بڑے آدمی کی میزبانی کا شرف انھیں حاصل ہوا ہے، ہاں احساس تھا کہ ہم اپنے باپو کو لے کر آئے ہیں۔ اور پھر اس سال پورے سشن میں گاندھی جی کی یہ آمد بچوں کا موضوع سخن بنی رہی۔

آخری بار گاندھی جی جامعہ میں آزادی کے بعد تشریف لائے۔ کاش یہ آنا آزادی کے لئے منائے گئے جشن میں ہوتا جب ہم سب اپنے سردار رہنما کے ساتھ مل کر آزادی کی خوشیاں مناتے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور وہ ہمیں آئندہ کے لئے راستہ بتاتے۔ مگر افسوس کہ یہ آمد اس وقت ہوئی جب جامعہ چاروں طرف سے خطروں میں گھری تھی اور جامعہ اور جامعہ والوں کی زندگی اور موت کا سوال درپیش تھا۔ دلّی میں چاروں طرف فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی، سارے پاکستان میں اور ہندوستان میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، اور اس وقت ہندوستان کا نجات دہندہ، امن کا دیوتا، آزادی کا علمبردار، جس کا دل خون ہورہا تھا، دلی پہنچا، دلّی جو ہندوستان کا دل ہے...... آج اس کی اور اس طرح پورے دیس کی اور انسانیت کی حفاظت کا بار اس نحیف وزار بوڑھے انسان کے کندھوں پر آپڑا تھا جس کے سینے میں بہت بڑا، بہت مضبوط دل تھا، دماغ میں آہنی عزم اور مقصد کی سچی لگن تھی۔ 9/ستمبر 1947ء کو گاندھی جی دلّی پہنچے تو لوگوں سے فوراً ہی جامعہ والوں کی خیریت دریافت کی اور اگلے دن بے خبر جامعہ نگر آن پہنچے۔

جامعہ میں اس وقت آس پاس کے گاؤں کے لئے اور مصیبت زدہ کئی سو مرد عورت اور بچے پناہ گزیں تھے۔ وہ لوگ اور خود جامعہ والے، ان کے بال بچے سب

جامعہ کی مرکزی عمارتوں میں رکھے گئے تھے کہ ایک جگہ حفاظت نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ ایک قسم کی فوجی سی تنظیم کردی گئی تھی۔ لوگوں کی ڈیوٹیاں بٹی ہوئی تھیں۔ نوجوان اور صاحبِ عزم لوگوں نے پہرہ دینے اور کمزوروں کی حفاظت کا کام اپنے ذمے لیا تھا، سارا کام بڑے ڈسپلن کے ساتھ ہورہا تھا اور اس چھوٹی سی ٹولی کے سردار اور رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو موت اور خوف سے بے نیاز سب کی حفاظت اور سیوا کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے بے تکلف جامعہ کے اندر اور شہر میں گھوما کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم سے بڑے نازک وقت پر کچھ فوجی سپاہی حفاظت کے لئے پہنچ چکے تھے۔

دس ستمبر کو لوگوں نے دیکھا کہ کچھ موٹریں چلی آرہی ہیں، الٰہی خیر۔ جانے دوست یا دشمن؟ مگر ایک موٹر میں اپنے سب سے بڑے دوست اور محبوب سردار کا چہرہ دیکھ کر ٹوٹے دلوں کی ڈھارس بندھی، بہادروں کا عزم اور بڑھا۔ مگر یہ چہرہ جو ہمیشہ اپنے ان ''عزیزوں'' کو دیکھ کر دلی مسرت سے دمک اٹھتا تھا اس وقت گمبھیر اور اداس تھا۔ دل کا درد آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ ان کے ساتھ اور کئی لوگ اور اخباروں کے نمائندے وغیرہ تھے۔ مگر جامعہ والوں کو اور کسی سے کیا مطلب! ڈاکٹر ذاکر حسین نے بڑھ کر استقبال کیا۔ ان کے ساتھ گاندھی جی آگے بڑھے۔ ایک طرف جامعہ کے مستعد کارکنوں نے مصیبت زدہ پناہ گزینوں کو قرینے سے بٹھا دیا تھا، دوسری طرف جامعہ کی برقعہ پوش عورتیں کھڑی امید کے اس مینارے کو دیکھ رہی تھیں۔ ان مصیبت زدہ دیہاتی لوگوں کو دیکھ کر گاندھی جی کے دل کا درد اور زیادہ بڑھ گیا۔ ان کی

درخواست پر ایک بوڑھے دیہاتی نے تفصیل سے اپنی اور اپنے گاؤں والوں کی بپتا سنائی جس کے آخری جملے کچھ اس طرح کے تھے "حضور ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ پہلے سب کچھ تھا اب کچھ نہیں رہا۔ ایک ایک کے پاس سو سو بھینسیں تھیں، روپیہ تھا، گھر بار تھا۔ کسی کی بچی مری، کسی کا بھائی، کسی کی ماں" اور یہ کہتے کہتے اس کی آواز گلے میں پھنس گئی اور لوگ بھی رونے لگے۔ گاندھی جی کا دل تو پہلے ہی سے خون رو رہا تھا۔ اور وہ تو آئے ہی سر سے کفن باندھ کر تھے کہ یا نفرت و عداوت کی اس آگ کو بجھائیں گے یا اپنی جان دیدیں گے۔ مگر دعویٰ کرنا ان کی عادت نہ تھی پھر بھی انھوں نے لوگوں کو سمجھایا، دلاسا دیا۔ ان کا یہ کہنا میں یہاں دلی آیا ہوں تو کچھ کروں گا...... یا پھر اپنی جان دیدوں گا۔ آپ خدا سے اپنا دھیان لگائیے۔ ڈریے نہیں۔ بھاگیے نہیں" ان چند جملوں ہی نے ٹوٹے دلوں پر مرہم رکھا، خوف اور دہشت کو دور کیا۔ مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ اس مردِ خدا کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ جو سچ مچ اپنی انمول جان اس عظیم مقصد کے لئے قربان کردے گا۔

جامعہ کی عورتوں کو ایک طرف کھڑا دیکھ کر گاندھی جی ان سے بھی مخاطب ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے حالات میں عورت کی پریشانی حد سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنی عزت اور اپنے پیاروں کی جان سے اپنی جان اسے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عورت کا حوصلہ بندھا رہے تو مرد کو اس سے بڑا سہارا ملتا ہے۔ وہ نراش اور بزدل نہیں ہوسکتا۔ پہلے تو گاندھی جی نے کہا! "ارے تم لوگ مجھ سے پردہ کرتی ہو۔ میں تمہارے باپ کے برابر ہوں" پھر ان کو ڈھارس بندھائی۔

''دیکھو ایک دن سب کو مرنا ہے، لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ مرنے سے ڈرنا کیا...... یہاں سے بھاگنا نہیں، مرنا ہی ہے تو بہادری سے، ہنستے ہوئے مرنا۔ ویسے فکر نہ کرو۔ میں آیا ہوں تو کچھ کروں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا پر بھروسہ رکھو'' وغیرہ وغیرہ۔

گاندھی جی واپس جانے لگے تو سارا مجمع اور زیادہ قریب آ گیا۔ جیسے ان کی موجودگی امید بلکہ یقین کا ستون تھی جس کا سہارا ٹوٹنے کا ڈر نہ ہو۔ گاندھی جی موٹر میں بیٹھے، مجمع بہت تھا، کسی نے زور سے موٹر کا پٹ بند کر دیا۔ گاندھی جی کا ہاتھ وہاں رکھا ہوا تھا۔ انگلیاں پس گئیں۔ مگر درد و تکلیف کا جو احساس بھی ہوا ہو چہرے پر اس وقت بھی شفقت بھری مسکراہٹ اور درگزر کا سچا احساس تھا۔

یہ جواہر لال نہرو کی کوشش، گاندھی جی کی جان کی بازی لگانے کا عزم اور سب سے بڑھ کر اس خدا کی مدد تھی (جس پر سب سے بڑھ کر خود گاندھی جی کو بھروسہ تھا) کہ جامعہ اور جامعہ والے، نہ صرف اس خون خرابے کی خوفناک فضا سے، بلکہ ساتھ ہی نفرت اور تعصب، تنگ نظری اور خوف کی بیماریوں سے بھی محفوظ رہے۔ اور پھر سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کو اس لعنت سے بچانے کے لئے گاندھی جی نے مرن برت رکھا جس نے فساد کی آگ پر چھینٹے ڈالے اور دلی اور ہندوستان میں پھر سے امن وامان قائم ہونے لگا جس سے گاندھی جی کو دلی مسرت تھی۔

2 رفروری کو گاندھی جی نے پھر جامعہ آنے کا وعدہ کیا تھا اور جامعہ والے اس مبارک دن کا انتظار اور انتظام کر رہے تھے کہ 30 رجنوری 1948ء کو یہ خبر ان کے دل و دماغ کو ہلا گئی کہ ان کے محترم، محبوب، چاہنے والے، ہمدرد، غم گسار، سرپرست

نے شہادت پائی۔ اس عظیم مقصد کے لئے اپنی جان نچھاور کردی جوان کی زندگی کا آدرش تھا، یعنی ہندو مسلم ایکتا۔

سوالات: حصہ الف

1) عظیم شخصیتوں کو پہچاننے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟

2) مہاتما گاندھی کی شخصیت وسیرت کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالئے؟

3) جامعہ ملیہ اسلامیہ کس طرح بدیسی اثرات سے آزاد ہوا؟

4) گاندھی جی کو کس ادارے سے خاص لگاؤ تھا اور اسے وہ کیا سمجھتے تھے؟

5) جامعہ ملیہ کس طرح ہندو مسلم اتحاد کا مرکز بنا؟

6) اپنے پوتے ''رسک لال'' کی موت کے سخت صدمے کی حالت میں گاندھی نے کیا کہا تھا۔

7) گاندھی جی نے جامعہ ملیہ کی مالی امداد کس طرح بہم پہنچائی۔

8) ڈرامہ ''جامعہ کی ابتدائی زندگی'' پر ایک نوٹ لکھئے۔

9) گاندھی جی کا کردار کس نے اور کیسے نبھایا؟

10) لڑکے کے سوال کے جواب میں گاندھی جی نے ایکتا اور اتحاد کے کام کے کونسے گر بتائے؟

11) جامعہ اور جامعہ والوں کی حفاظت میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی کیا خدمات تھیں؟

12) پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

13) بوڑھے آدمی نے گاندھی جی سے اپنی کیا بپتا سنائی؟

14) گاندھی جی نے جامعہ کی عورتوں کو کن الفاظ میں دلاسا دیا؟

15) گاندھی جی نے آخر کس مقصد کے لئے اپنی قیمتی جان گنوائی؟

حصہ ب تفصیلی سوالات

1) جامعہ ملیہ اسلامیہ کہاں آباد ہے؟ اس کی بقا کے لئے گاندھی جی کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

2) جامعہ ملیہ پر کون کونسی آفتیں ٹوٹ پڑیں اور کس طرح دور کی گئیں۔

3) ایکتا اور اتحاد کے لئے گاندھی جی کی قربانیاں گنوایئے۔

4) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کردار پر روشنی ڈالیں۔

حصہ ج: بحوالۂ متن تشریح کیجئے۔

1) ''جامعہ کا ہر بچہ میرا بچہ ہے'' اور ''اب تو جامعہ پر میرا حق اور زیادہ ہو گیا ہے''

2) جب وہ سر منڈائے، گاندھی جی کا سا حلیہ بنائے، ان کی سی دھوتی پہنے، عینک لگائے۔ لکڑی لئے اسٹیج پر آیا تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بات کرنے

کے انداز تک کی اس خوبی سے نقل کی گئی تھی کہ سب واہ واہ کر اٹھے۔''

3) ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا جب تک یہاں کے سب لوگ جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی سب شامل ہیں۔ سچی دوستی اور گہری محبت کے ساتھ بالکل ایک بن کر رہیں۔

4) حضور ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ پہلے سب کچھ تھا اب کچھ نہیں رہا۔ ایک ایک کے پاس سو سو بھینسیں تھیں، روپیہ تھا، گھر بار تھا، کسی کی بچی مری، کسی کا بھائی، کسی کی ماں۔

5) ''میں یہاں دلی آیا ہوں تو کچھ کرونگا۔ یا پھر اپنی جان دیدوں گا۔ ایک آپ خدا سے اپنا دھیان لگائیے۔ ڈریے نہیں۔ بھاگیے نہیں''

6) مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ اس مرد خدا کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ جو سچ مچ اپنی انمول جان اس عظیم مقصد کے لئے قربان کر دے گا۔

7) عورت کا حوصلہ بندھا رہے تو مرد کو اس سے بڑا سہارا ملتا ہے وہ نراش اور بزدل نہیں ہوسکتا۔''

8) ارے تم لوگ مجھ سے پردہ کرتی ہو۔ میں تمہارے باپ کے برابر ہوں''

9) دیکھو ایک دن سب کو مرنا ہے، لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ مرنے سے ڈرنا کیا۔ یہاں سے بھاگنا نہیں۔ مرنا ہی ہے تو بہادری سے۔ ہنستے ہوئے مرنا، ویسے فکر نہ کرو۔ میں آیا ہوں تو کچھ کروں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا پر بھروسہ رکھو وغیرہ وغیرہ

مسکراہٹ بھی اثر رکھتی ہے

سید محمد اسمٰعیل

مسکراہٹ بچے کی ہو یا بڑے کی یہ زندگی کی ایک بہت بڑی سعادت ہے۔ جو ہر فرد و بشر کے حصّے میں نہیں آتی۔ ہر مسکراہٹ سمندر کی لہروں کی طرح آگے پھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ماہرین نفسیات کا قول ہے کہ ہنستا ہوا انسان دوسروں کو بھی ہنسنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور نیم ہنسی کا دوسرا نام ہے مسکراہٹ جس کی ہر جہت ہر حالت بس اپنی ملائمت اور نرمی کے سبب دلکش اور دل نواز ہوتی ہے۔

مصور اور سنگ تراش اپنی بنائی ہوئی تصویر یا تراشے ہوئے پیکر کو لازماً مسکراتا پیش کرتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو بغیر مسکان کے مجسمے یا شبیہہ کی قدر و قیمت ہی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما بدھ اور مونالیزا کے مجسموں میں چھپی مسکراہٹ آج ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہے ان دونوں کی زیرلب مسکراہٹ میں جو دل کشی اور حسن پنہاں ہے۔ اس کی گہرائی تک آج تک کوئی قدردان پہنچ نہیں سکا۔ مسکراہٹ دراصل مصوری اور سنگ تراشی میں ایک فنّی کاری گری کا کام کرتی ہے۔ جب کسی تصویر یا مجسّمے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دی جائے تو اُس میں جان پڑ جاتی ہے۔ بھگوان بدھ کا مجسّمہ ہو یا سرسوتی کی تصویر ذرا غور سے دیکھیں تو آپ کو ایک نیا حسن اور وقار

اُن کی مسکراہٹ میں ملتا ہے۔ جو بڑے سے بڑے فنی کمال پر بھی بھاری ہونے کا حکم رکھتا ہے۔

ویسے مسکراہٹ مونالیزا کی ہو یا مدھو بالا کی۔ سرسوتی کی ہو یا لکشمی کی، نھو کی ہو یا رمضانی کی۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے ایک ہی انداز، ایک ہی دل کشی، ایک ہی حسن اور وہ یہ کہ ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے۔ افسردہ کو بھی شگفتہ بنا دیتی ہے، اس لیے ہر قیمت پر اس مسکراہٹ کو بنائے رکھنے کا بلکہ نبھائے رکھنے کا نام ہی زندگی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اگر دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے اسے ہر طرح سے خوش گوار بنانے کی مساعی کرنی ہے تو ہر طرح کے طور طریقوں سے مسکراہٹ پیدا کرنا ہوگی۔

مسکراہٹ کیلئے جب دولب وا ہوتے ہیں۔ تو ایک لکیر سی اُبھر آتی ہے۔ یہ لکیر یوں ہی پیدا نہیں ہو جاتی۔ یہ اس کی ذات کے اندر کی خوشبو اور خوش گوار نظریہ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لکیر کو ہم صرف مسکراہٹ کہہ سکتے ہیں کئی بار یہ لکیر پھیلتے پھیلتے بڑھتی جاتی ہے اور ایک قہقہہ کی صورت میں بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں کچھ آواز بھی پیدا ہوتی ہے جس میں آہنگ تو نہ سہی ایک اونچی آواز ضرور ہوتی ہے۔ اور جب آپ گلا کھول کر بلند آواز میں ہا ہا کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ کی بتیسی بھی نظر آنے لگے اسے مسکراہٹ دنداں نما کہہ سکتے ہیں ایک ہلکی لکیر سے دنداں نما تک مسکراہٹ کے کئی روپ ہیں کچھ خوش باش لوگوں کا خیال ہے کہ مسکراہٹ تکلف اور قہقہہ بے تکلفی کی علامت ہے اور یہ قول ایک حد تک صحیح بھی ہے۔

مسکراہٹ بڑا اثر رکھتی ہے اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا اور مخاطب آپ کی

مسکراہٹ یا آپ مخاطب کی مسکراہٹ پر گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی اجنبی انسان کے پاس جو آپ کا کچھ فائدہ کر سکتا ہو۔ بڑی توقعات لے کر چلے جائیں تو آنحضرت آپ کی بات یا دلیل یا عرض داشت پر مسکرا دیں تو سمجھ لیجئے کام بن گیا۔ مسکراہٹ کا وار شاذ ہی خالی جاتا ہے۔ یہ عموماً حلال کر کے ہی دم لیتی ہے۔

ستم یہ ہے کہ مسکراہٹ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، صبر و قناعت، ضبط اور توکّل پر خدا والا انسان ہی مسکراہٹ پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ ہر انسان اگر دنیاوی جھمیلوں میں کھو جائے تو اسے اپنی ہی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ ایسا بھلا مانس کیا مسکراہٹ پیدا کرے گا۔ کچھ یہ بھی صحیح ہے کہ انسان جتنا زیادہ ذہین، ذی حس اور پڑھا لکھا ہوگا، کچھ متین اور خشک رویّہ اپنا لے گا۔ جب کسی سے مخاطب ہوگا تو اس کی پیشانی پر سنجیدگی اور سکوت کے بل پڑنے لگیں گے۔ گفتگو کرے گا تو مُنہ بسور کر، کبھی کبھی ناک چڑھا کر اور بالعموم یوں صورت بنا لے گا کہ آپ بے ساختہ کہہ اُٹھیں: ''کیوں صاحب'' آپ رو رہے ہیں یا اداس ہیں؟

اس لمحہ اگر کوئی منچلا پاس بیٹھا ہوگا تو فوراً ''جواب دے گا'' ''جناب یہ رو نہیں رہے ان کی شکل ہی ایسی ہے''۔ تو ایسی شکل والے افراد ہمارے سماج میں بھرے ہوئے ہیں، جن کا مسکراہٹ سے خداواسطے کا بیر ہے ان پر محض مسکرا دینا مناسب ہوگا۔

ابن الوقت، خودغرض اور مفاد پرست لوگ مسکراہٹ کو ایک فن کی طرح برتتے ہیں ان کی مسکراہٹ کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ محض اپنے مفاد کا حصول۔ چنانچہ اگر پھیکی

یا جھوٹی مسکان سے اگر ایسے صاحب کچھ مسکراہٹ کا تاثر پیدا کرنا چاہیں تو آپ شیکسپیئر کے مقولے کو ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ جو فرماتے ہیں ''کوئی مسکرائے، مکرر مسکرائے اور مسکراتا ہی جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ آدمی ولین (VILLAIN) ہے''

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسکراہٹ زندہ دلی کی علامت ہے ظاہر ہے کہ ہر انسان زندہ دل نہیں ہوتا۔ دوسروں کے واسطے مسکراہٹ کے ذریعے خوشی کے احساس کو زندہ و جوان رکھنا بڑے ظرف کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنتوں مہاتماؤں اور صوفیوں نے اسے بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ ایسے پہنچے ہوئے لوگ بلکہ مہاپرش دل و جان سے مسکراتے ہیں۔ سماج کے ہر فرد کو خوش رکھنے کی خاطر اور اُسے نفسیاتی توانائی دینے کیلئے ضرور مسکراتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ پر آپ فدا ہونے کو تیار ہو جائیں گے۔

ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ مسکراہٹ روح کی طرح پاک و صاف رہتی ہے اس میں بناوٹ کا دخل بہت زیادہ نہیں ہوتا، یہ بالعموم سونے کی طرح کھری ہے جس پر ملمع کاری ممکن نہیں۔ اگر کچھ کاروباری یا سماجی مصلحت کی وجہ سے شکنوں کی کھینچا تانی سے اگر مسکراہٹ کا انداز یا رنگ پیدا بھی کر دیں تو وز دیدہ نگاہیں اصلیت بھانپ لیتی ہیں۔

الغرض آپ نہ بھی بھانپ سکیں تو بھی مسکراہٹ کی ہمہ گیریت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ سونا آخر سونا ہے۔

بنیادی طور پر یہ باور کرنا پڑے گا کہ مسکراہٹ کا خمیر روح کے سکون اور قلب

میں رواداری کے مادّے سے ہی تیار ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ والے لوگوں کے ہونٹوں پر اداسی یا یاس کی بجائے مسکراہٹ کھیلتی ہے، اور یہی پہچان ہے اللہ والوں کی روحانیت کی معراج کی، اُنکی طہارت و پاکیزگی کی، سوامی وویکانند ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''اگر آپ ہر وقت خوش گوار موڈ میں مسکراتے رہیں تو آپ کا یہی رویہ آپ کو خدا کا قرب نصیب کرائے گا۔ اس طرح کی قربت بڑی سے بڑی ریاضت اور پاکیزگی اور بندگی سے حاصل نہیں ہوسکتی''۔

فلم ہو یا ناول، سماجی زندگی ہو یا گھریلو زندگی جب ایک محبت بھرے دل سے محبت کا اظہار مقصود ہو تو یہ اظہار مسکراہٹ کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ خصوصاً دو اجنبی کرداروں یا دو محبت کرنے والوں میں مسکراہٹ اولین تعارف کا فرض و حق ادا کرتی ہے۔ اور پھر یہ مسکراہٹیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور ان مسکراہٹوں سے ہی ایک دن محبت کا تاج محل تعمیر ہو جاتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہر عاشق اپنی محبوبہ کیلئے اور ہر خاوند اپنی بیوی کیلئے تاج محل تعمیر کرانے کی توفیق نہیں رکھتا۔ اگر شاہ جہاں یہ توفیق رکھتا تھا تو اس کی مسکراہٹ تو امر ہوگئی۔ اور تاج محل میں ڈھل گئی۔ آج اس تاج محل کی دیواروں کے سائے میں شادی شدہ جوڑے حتیٰ کہ بوڑھے مرد اپنی بوڑھی رفیقۂ حیات کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی تصویر کھنچواتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

مسکراہٹ اور تہذیب ہم جولی ہیں اگرچہ ان کا اپنا انداز اپنی کیفیت اور اپنا رنگ ہے ویسے آج کے سائنسی دور میں انسانی تہذیب بہت آگے نکل آئی ہے۔ ہزاروں میل کی مسافت طے کر چکی ہے۔ اور پھر کئی سنگ میل بھی پار کیے ہیں۔ کئی منازل کو

عبور کر کے اس کی پیش رفت جاری ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ آج انسان اپنی انفرادی و مجلسی زندگی کو ترقی و تعمیر پذیر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی ترقی و تعمیر کی دوڑ میں انسان نے اپنی مسکراہٹ تو بڑی حد تک قربان کر دی ہے۔ نہ وہ ستانا جانتا ہے نہ سانس لینا، چنانچہ اس کیلئے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اپنے موڈ کو موافق و خوش گوار رکھنے کیلئے مسکرائے ضرور، اس طرح کی مسکراہٹ سے ایک تازگی، شگفتگی اور توانائی نصیب ہو سکتی ہے اور یاسیت کی جگہ اُمید افزا فضا اور نظریہ پروان چڑھ سکتا ہے۔

آج کے انسان کو زندگی بسر کرنے کا آرٹ بھی آنا ضروری ہے۔ صرف ہماہمی اور مشینوں کی طرح بھاگ دوڑ ہی زندگی کا جواب نہیں اور زندگی کا آرٹ روپے پیسے، جلال و حشمت یا علم و حکمت سے نہیں آتا، مسکراہٹ قائم رکھنے اور اُسے نبھانے کیلئے دانستہ مساعی اور اپنے تئیں نیک نیتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ فرد کے اختیار و مرضی پر رہا کہ وہ مسکراہٹ سے توانائی اور تازگی حاصل کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔

ایک طبقے کا خیال ہے کہ مسکراہٹ زندگی میں دھوپ چھاؤں کی طرح چلتی ہے گولڈ اسمتھ مسکراہٹ کو ایک شراب سے تشبیہ دیتے ہیں جو عمر اور علم کے ساتھ زوال پذیر ہوتی رہتی ہے ویسے بیشتر ادیبوں اور مفکروں نے مسکراہٹ کے حق میں بڑے بڑے دلائل پیش کیئے ہیں اور سنجیدہ فلسفیوں، مذہبی رہنماؤں اور مفکروں نے یہ جتلانے کی کوشش کی ہے کہ مسکراہٹ ہماری شخصیت کے نہاں خانے میں موجود ہوتی ہے۔ ہاں یہ ان لوازمات سے حاصل نہیں ہوتی۔ جو ہماری تفریح کا سامان پیدا کرتی

ہیں۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ اگر ہماری روح مسکراہٹ کا جواز ڈھونڈ لے تو ہمیں زندگی کی ہر شئے، قدرت کے ہر منظر، سماج کے ہر فرد سے تفریح وسکون میسّر ہوسکتا ہے۔ اور دکھ نام کی کوئی چیز ہماری زندگی میں نہیں رہتی۔

روحانی مشاہیر اور اہل باطن نے مسکراہٹ کیلئے یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ جس طرح اہل باطن اس دنیا میں اپنی مسکراہٹ کا جواز نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح عام انسانوں کو بھی اپنی مسکراہٹ کا جواز تلاش کرنا ہوگا۔ اگر ہر حال میں مسکرانا اور راضی بہ رضا اپنا مطمحِ نظر ہو جائے، تو مسکراہٹ انسان کے قدم چومتی ہے۔ ہر راضی بہ رضا مطمحِ نظر اپنانے کیلئے بڑے ضابطے، صبر، استقلال اور حوصلے کی ضرورت ہے اور اسی لیے مسکراہٹ کی ڈگر کٹھن معلوم ہوتی ہے اور بقول اقبالؔ صاحب

ع یہ کام ہیں انہی کے جن کے حوصلے ہیں زیادہ

سوالات: حصّہ (الف)

1) مسکراہٹ کے بارنے میں ماہرین نفسیات کا قول لکھئے

2) ایک مصور اور سنگ تراش اپنی تصویر یا تراشے کو مسکراتا کیوں پیش کرتا ہے۔

3) بھگوان بدھ اور سرسوتی کی تصویر کو بغور دیکھنے سے کیا محسوس ہوتا ہے۔

4) کیا مسکراہٹ کو بنائے رکھنے کا نام زندگی ہے؟

5) مسکراہٹ کیسے پیدا ہوتی ہے اور کس طرح قہقہہ میں بدل جاتی ہے؟

6) مسکراہٹ دنداں نما کسے کہتے ہیں؟

7) ''مسکراہٹ بڑا اثر رکھتی ہے'' کیسے؟

8) مسکراہٹ کون پیدا کر سکتا ہے؟

9) کون لوگ مسکراہٹ کو ایک فن کی طرح برتتے ہیں۔ اور کیوں؟

10) شیکسپیر نے ولین (Villain) کی کیا پہچان بتائی ہے؟

11) ذیل کے الفاظ کے معنی لکھیے:

سعادت، مسکان، سنگ تراش، پنہاں،

مصور، افسردہ، شگفتہ، مساعی، واہونا، بتیسی

توقعات، شاذ، ہمہ گیریت، باور، مشاہیر

حصہ (ب) بحوالۂ متن تشریح کیجیے:

1) بھگوان بدھ کا مجسمہ ہو یا سرسوتی کی تصویر، ذرا غور سے دیکھیں تو آپ کو ایک نیا حُسن اور وقار ان کی مسکراہٹ میں ملتا ہے جو بڑے بڑے فنی کمال پر بھی بھاری ہونے کا حکم رکھتا ہے۔

2) مسکراہٹ بڑا اثر رکھتی ہے اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا اور مخاطب آپ کی مسکراہٹ یا آپ مخاطب کی مسکراہٹ پر گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

3) گفتگو کرے گا تو منہ بسور کر، کبھی کبھی ناک چڑھا کر اور بالعموم یوں صورت بنالے گا کہ آپ بے ساختہ کہہ اٹھیں کیوں صاحب، آپ رو رہے ہیں، یا اداس ہیں؟

4) کوئی مسکرائے، مکرّر مسکرائے اور مسکراتا ہی جائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ آدمی ولین (Villain) ہے۔

5) روح کی طرح پاک وصاف رہتی ہے اس میں بناوٹ کا دخل بہت زیادہ نہیں ہوتا یہ بالعموم سونے کی طرح کھری ہے جس پر ملمع کاری ممکن نہیں۔

حصّہ (ج): تفصیلی جوابات لکھیے

1) مسکراہٹ کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالیے

2) مسکراہٹ کا خمیر کیسے تیار ہوتا ہے؟ اور بتایئے کہ کیا مسکراہٹ روحانیت کی معراج اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بھی ہے، مدلل لکھیے۔

3) ہماری زندگی میں مسکراہٹ کیا رول ادا کرتی ہے۔ تفصیل کے ساتھ لکھیے

عملی کام:-

''مسکراہٹ'' پر اپنے الفاظ میں ایک مضمون لکھیے۔

پنچ پرمیشور

پریم چند

جمن شیخ اور الگو میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی۔ لین دین میں کچھ ساجھا تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد۔ جمن جب حج کرنے کو گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے اور الگو جب باہر جاتے تو جمن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے۔ وہ ہم نوالہ تھے نہ ہم پیالہ، نہ ہم مشرب، صرف ہم خیال تھے، اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا، جب دونوں لڑکے جمن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے روبرو زانوئے ادب تہہ کرتے تھے، الگو نے استاد کی بہت خدمت کی خوب رکابیاں مانجھیں۔ خوب پیالے دھوئے، انکا حقہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر نہ تھا۔ جسے الگو خوب جانتے تھے۔ ان کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے تعلیم کے مقابلہ میں انھیں استاد کی خدمت پر زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ استاد کی دعا چاہئے جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کے فیض سے ہوتا ہے اور اگر الگو پر استاد کے فیض یا دعاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا تو اسے تسکین تھی کہ تحصیل علم کا کوئی، دقیقہ اس نے فروگزاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر میں نہ تھا۔ شیخ

جمعراتی خود دعا اور فیض کے مقابلہ میں تازیانہ کے زیادہ قائل تھے اور جمن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے اسی کا فیض تھا کہ آج جمن کے قرب و جوار کے موضعات میں پرستش ہوتی تھی۔ان کے بیع نامہ یا رہن نامہ کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہ اٹھا سکتا تھا۔حلقہ کا پوسٹ مین کانسٹبل اور تحصیل کا مذکوری یہ سب ان کے دست کرم کے محتاج تھے۔اس لیے اگر الگو کو ان کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا۔تو شیخ جمن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث عزّت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

(۲)

شیخ جمن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں۔ان کے پاس کچھ تھوڑی سی ملکیت تھی۔ مگر قریبی وارث کوئی نہ تھا۔جمن نے وعدے وعید کے سرسبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرا لی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ پر رجسٹری نہیں ہوئی تھی۔خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوئی تھیں۔خوب میٹھے لقمے اور چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے،مگر رجسٹری کی مہر ہوتے ہی ان کی خاطر داریوں پر بھی مہر لگ گئی۔وہ وعدے وصال کے وعدے ثابت ہوئے۔جمن کی اہلیہ بی فہیمن نے روٹیوں کے ساتھ کچھ تیز تیکھی باتوں کے سالن بھی دینے شروع کر دیئے اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے بڑھنے لگی۔ بڑھیا عاقبت کے بورئے بٹورے گی کیا؟ دو تین بیگھے اوسر کیا دے دیا ہے گویا مول لے لیا ہے بگھاری دال بغیر روٹیاں نہیں اُترتیں، جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں جھونک چکے۔اس کے تو اب تک کئی گاؤں مول لے

لیتے۔ کچھ دنوں تک خالہ جان نے سنا اور ضبط کیا۔ مگر جب برداشت نہ ہوئی تو جمن سے شکایت کی۔ جمن صلح پسند آدمی تھے۔ ''مقامی کارکن'' کے انتظام میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دن اور یوں ہی رودھو کر کام چلا۔ آخر ایک روز خالہ جان نے جمن سے کہا۔

''بیٹا! تمہارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپیہ دے دیا کرو میں اپنا الگ پکالوں گی۔''

جمن نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے؟''

خالہ جان نے بگڑ کر کہا۔

''تو مجھے کچھ نان نمک چاہیے یا نہیں؟''

جمن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا'' ۔چاہیے کیوں نہیں۔ میرا خون چوس لو۔ یہ کوئی تھوڑے ہی سمجھتا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کے آئی ہو۔

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں۔ جامہ سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمن ہنسے، وہ فاتحانہ ہنسی جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ کہا'' ۔ہاں ضرور پنچایت کرو۔ فیصلہ ہو جائے مجھے بھی رات دن کا وبال پسند نہیں۔''

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اُٹھے گی، اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا قرب وجوار میں ایسا کون تھا جو ان کا شرمندہ منّت نہ ہو، کون تھا جو انکی دشمنی کو حقیر

سمجھے؟ کس میں اتنی جرأت تھی، جوان کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ آسمان کے فرشتہ تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں۔ مریض نے آپ ہی دوا طلب کی۔

(۳)

اس کے بعد کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لیے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہی۔ کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا، مگر بات آپڑی تھی اس کا تصفیہ ضروری تھا۔ شیخ جمن کو اپنی طاقت، رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ وزاری کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ مگر خوبی تقدیر کوئی اس کی طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں ہوں کر کے ٹال دیا، کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ ذرا اس ہوس کو دیکھو۔ قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آج مریں کل دوسرا دن ہوا، مگر صبر نہیں ہوتا۔ پوچھو اب تمہیں گھر بار، جگہ زمین سے کیا سروکار۔ ایک لقمہ کھاؤ۔ ٹھنڈا پانی پیو اور مالک کی یاد کرو، سب سے بڑی تعداد ستم ظریفوں کی تھی۔ خمیدہ کمر پوپلا منہ سن کے سے سفید بال اور ثقل سماعت جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں ہنسی کا آنا ایک قدرتی امر ہے۔ غرض ایسے دردرس انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جنھوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا اور اس کی تشفی کی ہو چاروں طرف سے گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔ لاٹھی پٹک دی اور دم لے کر کہا۔

''بیٹا! تم بھی چھن بھر کو میری پنچایت میں چلے آنا''۔

الگو بے رخی سے بولے۔ ''مجھے بلا کر کیا کرو گی کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں گے ہی۔''

خالہ نے ہانپ کر کہا۔

''اپنی پھریاد تو سب کے کانوں میں ڈال آئی ہوں آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے ہمارے سدِ سالار گائے گہار سُن کر پیڑھی سے اُٹھ آئے تھے۔ کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا؟''

الگو نے جواب دیا۔ ''یوں آنے کو تو میں آجاؤں گا۔ مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا۔''

خالہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا؟''

الگو نے پیچھا چھڑانے کیلئے کہا۔

''اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت، جمن میرے پُرانے دوست ہیں اُن سے بگاڑ نہیں سکتا''۔

خالہ نے تاک کر نشانہ مارا۔ ''بیٹا! کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟''

''ہمارے سوئے ہوئے ایمان کی ساری جتھا چوری لُٹ جائے۔ اُسے خبر نہیں ہوتی۔ مگر کھلی ہوئی للکار سُن کر وہ چونک پڑتا ہے اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔ الگو چودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ کیا وہ ''نہیں'' کہنے کی جرأت کر سکتے تھے؟''

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی ٹاٹ بچھا ہوا تھا، حقّہ، پان کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ جمن کی مہمان نوازی تھی، وہ خود الگو چودھری کیساتھ ذرا دور بیٹھے ہوئے، حقّہ پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا کہ با اثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے تھے۔ جنھیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پروانہیں ہوسکتی تھی کُتے مجلس کو دعوت احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی خالہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ ''پنچو! آج تین سال ہوئے میں نے اپنی سب جائداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھوادی تھی۔ اُسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمن نے مجھے تاحین حیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے انکے ساتھ کسی نہ کسی طرح رودھو کر کاٹے مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بیکس بیوہ ہوں۔ تھانہ کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم لوگ جو راہ نکال دو، اس راہ پر چلوں اگر میری برائی دیکھو میرے منہ پر تھپڑ مارو جمن کی بُرائی دیکھو تو اُسے سمجھاؤ کیوں ایک بے کس کی آہ لیتا ہے''

رام دھن مصر بولے (ان کے کئی آدمیوں کو جمن نے توڑ لیا تھا) جمن میاں پنچ کسے بدتے ہو، ابھی سے طے کرلو۔''

جمن نے حاضرین پر ایک اڑتی ہوئی نگاہ ڈالی اپنے تیں مخالفوں کے نرغے

میں پایا۔ دلیرانہ انداز میں کہا۔ ’’خالہ جان! جسے چاہیں پنچ بنائیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

خالہ نے چلا کر کہا۔

’’ارے اللہ کے بندے! تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا؟‘‘

جمن نے بڑھیا کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ’’اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ۔ جسے چاہو پنچ بنا دو۔‘‘

خالہ نے جمن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں۔ ’’بیٹا خدا سے ڈرو میرے لئے کوئی ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہی ہیں؟ اچھا اور سب کو جانے دو۔ الگو چودھری کو تو مانے گا؟‘‘

جمن فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے، مگر ضبط کر کے بولے۔ ’’الگو چودھری ہی سہی۔ میرے لیے جیسے رام دھن مصر ویسے الگو، کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔‘‘

الگو بغلیں جھانکنے لگے۔ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے معترضانہ انداز سے کہا۔ ’’بوڑھی اماں! تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے!‘‘

خالہ نے جواب دیا۔ ’’بیٹا! دوستی کیلئے کوئی اپنا ایمان نہیں کھوتا پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے۔‘‘

الگو کو کوئی چارہ نہ رہا۔ سرپنچ بنے، رام دھن مصر بڑھیا کو دل ہی دل میں کوسنے لگے۔‘‘

الگو چودھری نے فرمایا ’’شیخ جمن ہم اور تم پرانے دوست ہیں جب ضرورت

پڑی ہے تم نے میری مدد کی ہے اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے تمہاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو نہ ہم تمہارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا تم کو جو کچھ کہنا ہو تم بھی کہو۔''

جمن ایک شان فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ''پنچو! میں خالہ جان کو اپنی ماں کے بجائے سمجھتا ہوں۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں؟ عورتوں میں ذرا اَن بَن رہتی ہے۔ اس میں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھُپی نہیں۔ آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔''

الگو چودھری کو آئے دن عدالت سے سابقہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے۔ جمن سے جرح کرنے لگے۔ ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان کے سوالوں کی داد دیتے تھے۔ جمن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ اچھی دوستی نباہی! اِس سے اچھے تو رام دھن ہی تھے۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ کون کون سے کھیت کتنے پر اُٹھتے ہیں اور کیا نکاسی ہوتی ہے۔ ظالم نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ کر لیا اور نہایت متین اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''شیخ جمن! پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمہاری

ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ خالہ جان کے ماہوار گزارنے کا بندوبست کرو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔''

جمن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آ گئے۔ احباب سے کہنے لگے!

''بھئی اس زمانہ میں یہی ہے دوستی، کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے۔ اس کی گردن پر چھری پھیری جائے۔ اس کو نیرنگیٔ روزگار کہتے ہیں۔ اگر لوگ ایسے دغاباز جو فروش گندم نما ہوتے تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں۔ یہ ہیضہ اور پلیگ انھیں مکاریوں کی سزا ہے۔''

مگر رام دھن مصر اور جگو سنگھ اس بے لاگ فیصلہ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اس کا نام پنچایت ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی دوستی دوستی کی جگہ ہے۔ مقدم ایمان کا سلامت رکھنا ہے، ایسے ہی ستیہ وادیوں سے دنیا قائم ہے ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔

اس فیصلہ نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درخت حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے مگر تیر و سپر کی طرح۔ جمن کے دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا۔ اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

(۵)

خوش قسمتی سے موقع بھی مل گیا پچھلے سال الگو چودھری بٹیسر کے میلے سے بیلوں کی ایک اچھی

گوئیں مول لائے تھے۔ پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے۔ مہینوں تک قرب وجوار کے لوگ انھیں دیکھنے آتے۔

اس پنچایت کے ایک مہینہ بعد ایک بیل مر گیا جمن نے اپنے دوستوں سے کہا یہ دغابازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کر جائے۔ مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔ الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمن نے اسے زہر دلوادیا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائن کو خیال آتا کہ اس پر بھی کچھ کرادیا گیا ہے۔ چودھرائن اور فہمین میں ایک روز زور شور کی ٹھنی۔ دونوں خاتونوں نے روانی بیان کی ندی بہادی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمن نے آگ بجھائی بیوی کو ڈانٹا اور رزم گاہ سے ہٹا لے گئے۔ الگو چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں کلامیوں کی داد دی۔

اب ایک بیل کس کام کا، اس کا جوڑا بہت ڈھونڈا، مگر نہ ملا، ناچار اُسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سمجھو سیٹھ تھے، وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے گاؤں میں گُڑ گھی بھرتے اور منڈی لے جاتے۔ منڈی سے تیل، نمک لاد کر لاتے۔ گاؤں میں بیچتے، اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی۔ سوچے اسے لے لوں تو دن میں بلا کسی محنت کے تین کھیوے ہیں۔ نہیں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا گاڑی میں دوڑایا۔ بال بھنوری کی پہچان کرائی۔ مول بھاؤ کیا اور اپنے دروازے پر لا کر باندھ دیا۔ دام کے لئے ایک مہینہ کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے۔ گھاٹے کی کچھ پروانہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا۔ تو پاؤں پھیلائے، دن میں تین تین چار چار کھیوے کرتے

نہ چارے کی فکر تھی نہ پانی کی بس کھیوں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے وہاں کچھ سوکھا بھُس ڈال دیا اور غریب جانور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا۔ الگو چودھری کے یہاں تھے تو چین کی بنسی بجتی تھی۔ راتب پاتے، صاف پانی، دلی ہوئی ارہر، بھوسے کے ساتھ کھلی، کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی مل جاتا۔ شام وسویرے ایک آدمی کھریرے کرتا، بدن کھجلاتا، جھاڑتا، پونچھتا، سہلاتا، کہاں وہ ناز ونعمت کہاں یہ آٹھوں پہر کی رپٹ۔ مہینے بھر میں بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جوا دیکھتے ہی بے چارے کا ہیاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دوبھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ لیکن اصیل جانور، مار کی تاب نہ تھی، ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ جی نے دونا بوجھ لادا۔ دن بھر کا تھکا جانور، پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لے۔ ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر۔ کئی کوڑے بے دردی سے لگائے۔ بیل نے ایک بار پھر زور لگایا مگر طاقت نے جواب دیدیا۔ زمین پر گر پڑا۔ اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ سیٹھ نے بہت پیٹا، ٹانگ پکڑ کر کھینچی نتھنوں میں لکڑی ٹھونس دی۔ مگر لاش نہ اٹھی۔ تب کچھ اندیشہ ہوا۔ غور سے دیکھا بیل کو کھول کر الگ کیا۔ اور سوچنے لگے کہ گاڑی کیوں کر گھر پہنچے۔ بہت چیخے اور چلائے مگر دیہات کا راستہ بچوں کی آنکھ ہے سرِ شام سے بند۔ کوئی نہ نظر آیا۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا۔ مارے غصّے کے موئے بیل پر اور دُرّے لگائے سسرے! تجھے مرنا تھا تو گھر پر مرتا۔ تو نے آدھے راستہ میں دانت نکال دیئے.........اب گاڑی کون کھینچے؟ اس طرح خوب جلے بھُنے کئی بورے گڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دو ڈھائی

سو روپے کمر میں بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے چھوڑ کر جا بھی نہ سکتے تھے۔ گاڑی پر لیٹ گئے۔ وہیں رات جگا کرنے کی ٹھان لی۔ اور آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے۔ حقہ پیا۔ آگ جلائی۔ تاپا۔ اپنی دانست میں تو وہ جاگتے رہے۔ مگر جب بو پھٹی، چونکے اور کمر پر ہاتھ رکھا۔ تو تھیلی ندارد کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کمر ٹٹولی، تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا۔ پچھاڑیں کھانے لگے۔ صبح کو بہ ہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثہ المناک سنا تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے تو خوب روئیں تب الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظ ماتقدم کی سوجھی۔ نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگتے تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلائے ہوئے کتوں کی طرح چڑھ جاتے۔ یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ فقیر ہو گئے۔ انھیں دام کی پڑی ہے۔ مردہ منحوس بیل دیا تھا۔ اس پر دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دھول جھونکتے ہیں۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے، کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ۔ تب دام لینا۔ صبر نہ ہوتا ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو، اور کیا لو گے؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدردان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سن کر چودھری لوٹ آئے مگر ڈیڑھ سو روپے سے اسطرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔ ایک بار وہ بھی بگڑے۔ سیٹھ جی گرم ہو پڑے سیٹھانی جی جذبے کے مارے گھر سے نکل پڑیں۔ سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مباحثہ ہوا، مجادلہ کی نوبت آ پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ

بند کر لئے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہو گئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا۔ اور صلاح دی کہ آپس میں سر پھٹول سے کام نہ چلے گا۔ اس سے کیا فائدہ؟ پنچایت کر لو۔ جو کچھ طے ہو جائے اسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے۔ الگو نے بھی حامی بھری فیصلہ ہو گیا۔

(٦)

پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت تھا۔ کھیتوں میں کوؤں کی پنچایت لگی ہوئی تھی۔ امر متنازعہ یہ تھا کہ مٹر کی پھلیوں پر اس کا جائز استحقاق ہے یا نہیں؟ اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے وہ رکھوالے لڑکے کی فریاد بے داد پر اپنی بلاغت آمیز ناراضگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درخت کی ڈالیوں پر طوطوں میں سرگرم مباحثہ ہو رہا تھا۔ بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انھیں من حیثیت القوم بے وفا کہنے کا کیا حق حاصل ہے؟

پنچایت پوری آ بیٹھی۔ تو رام دھن مصر بولے۔ ''اب کیوں دیر کی جائے بولو چودھری! کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟''

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا۔

''سمجھو سیٹھ ہی چن لیں''

سمجھو سیٹھ کھڑے ہو گئے اور کڑک کر بولے۔ میری طرف سے شیخ جمن کا نام لکھ لو۔''

الگو نے پہلا نام جمن کا سُنا۔ اور کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہہ پر پہنچ گئے۔ بولے۔''
چودھری! تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟''

چودھری نے مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔
''نہیں مجھے کوئی عذر تو نہیں ہے!''

اس کے بعد چار نام اور تجویز کئے گئے۔ الگو پہلا چر کا کھا کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا۔ صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا۔ الگو اس فکر میں تھے کہ اس مرحلے کو کیوں کر طے کروں کہ یکایک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گوڈر شاہ بولے۔
''سمجھو بھائی! سرپنچ کسے بناتے ہو؟''
سمجھو کھڑے ہو گئے اور اکڑ کر بولے
''شیخ جمن کو؟''

رام دھن نے مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا۔''
الگو! تمھیں کوئی عذر ہو تو بتاؤ۔''

الگو نے قسمت ٹھونک لی۔ حسرت ناک لہجہ میں بولے'' نہیں مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔''

اپنی ذمہ داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے۔اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما۔

ایک اخبار نویس، اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلس وزرا کو کتنی بے باکی اور آزادی سے اپنے تازیانۂ قلم کا نشانہ بناتا ہے۔مگر ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب وہ خود مجلس وزراء میں شریک ہوتا ہے۔اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالم شباب میں کتنا بے فکر ہوتا ہے! والدین اسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اُسے ننگ خاندان سمجھتے ہیں، مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد وہی وارفتہ مزاج ننگ خاندان کتنا سلامت رو، کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔یہ احساس ہماری نگاہوں کو وسیع کر دیتا ہے۔

شیخ جمن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمہ داری کا احساس ہوا۔اس نے سوچا میں ''اس وقت انصاف کی مسند پر بیٹھا ہوں۔میری آواز اس وقت حکم خدا ہے۔اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہ ہونا چاہئے۔حق اور راستی سے جو بھر ٹلنا بھی مجھے دین اور دنیا دونوں ہی میں رُوسیاہ بنا دے گا۔''

پنچایت شروع ہوئی۔فریقین نے اپنے حالات بیان کئے۔جرح ہوئی شہادتیں گزریں۔فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی۔جمن نے بہت

غور سے سنا اور تب فیصلہ سنایا۔

''الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ پنچوں نے تمہارے معاملہ پر غور کیا۔ سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے۔ جس وقت بیل ان کے گھر آیا۔ اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو آج سمجھو واپس لینے کا تقاضہ نہ کرتے۔''

رام دھن مصر نے کہا۔

''قیمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے۔ سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالا۔''

جمن نے کہا۔

''اس کا اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے''

گوڈر شاہ نے کہا۔

''سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیئے اس کا بہت نقصان ہوا ہے۔ اور اپنے کئے کی سزا مل چکی ہے۔''

جمن بولے...... ''اس کا بھی اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے۔ یہ فیصلہ سنتے ہی الگو چودھری پھولے نہ سمائے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے اور زور سے ہانک لگائی۔

''پنچ پرمیشوری کی جے۔''

آسمان پر تارے نکل آئے تھے، اس نعرے کے ساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی۔ بہت مدھم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔

ہر شخص جمن کے انصاف کی داد دے رہا تھا۔ ''انصاف اس کو کہتے ہیں آدمی کا یہ کام نہیں۔ پنچ میں پرماتما بستے ہیں۔ یہ انکی مایہ ہے پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا

بنانا مشکل ہے۔"

گھنٹہ بھر کے بعد شیخ جمن الگو چودھری کے پاس آئے اور انکے گلے سے لپٹ کر بولے۔

بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے۔ میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ انصاف کے سوائے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ یہ بھی خدا کی شان ہے۔ آج مجھے یقین ہوگیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہوتا ہے۔"

الگو رونے لگے۔ دل صاف ہوگئے۔ دوستی کا مرجھایا ہوا پھول پھر ہرا بھرا ہوگیا۔ اب وہ بالو کی زمین پر نہیں۔ حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

سوالات:

1) جمن شیخ اور الگو چودھری کیسے دوست تھے؟

2) بوڑھی خالہ کی جائداد اپنے نام کروا لینے کے بعد جمن اور اس کی بیوی نے اس ضعیفہ کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

3) پنچایت میں بوڑھی خالہ نے حاضرین کو کیسے مخاطب کیا؟

4) الگو چودھری نے اپنے دوست شیخ جمن کے خلاف کیسا فیصلہ سنایا؟

5) سمجھو سیٹھ نے الگو کے بیل کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

6) شیخ جمن کا فیصلہ سن کر الگو چودھری نے کیا کہا؟

بھیک

حیات اللہ انصاری

کیلاش کی لاری پتھوراگڑھ کے خشک بنجر اور تپتے ہوئے پہاڑوں کو ایک در سے پار کر کے موتی نگر کی وادی میں داخل ہوئی۔ اور داخل ہوتے ہی منظر اور موسم اور مسافروں کا مزاج سب کچھ بدل گیا۔ سامنے ایک طرف نندا دیوی اور ترسول کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں اور دوسری طرف ڈھلوان پہاڑوں پر سیب، ناشپاتی، اور آلوچوں کے باغوں کی ہریالی تھی جو پہاڑوں کے سلسلوں سے زینہ بہ زینہ اترتی ہوئی نیچے جا کر گھنے درختوں اور نامعلوم تاریکیوں میں گم ہو جاتی تھی۔

جب لاری اسٹینڈ پر پہنچی کیلاش اپنی بہنوں سمیت اترا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے آج کوئی بہت بڑا تہوار ہے جسے پہاڑ اور ان کی چوٹیاں، درخت اور چڑیاں آسمان اور سورج یہ سب کے سب انسانوں کے ساتھ مل جل کر منا رہے ہیں۔ اس خوش گوار منظر میں کیلاش ایسا کھویا کہ اسے اپنی سخت بیماری کی وجہ سے زندگی کی طرف سے جو مایوسی تھی وہ بالکل دور ہوگئی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے آسمان کو چومنے والے پہاڑ اشاروں میں کہہ رہے ہیں کہ ہماری شاندار صاف وشفاف اور دل کش دنیا میں بیماری اور مصیبتوں کا کیا کام۔ لاری اسٹینڈ سے ایک سڑک پر بل

کھاتی ہوئی جھومتی جھامتی آبادی کی طرف جاتی تھی۔ اس نے کیلاش کو ایسا لبھایا کہ وہ نوکر سے جو اسباب کو اٹھوانے میں لگا ہوا تھا یہ کہہ کر کہ میں ڈاک بنگلے کی طرف چلتا ہوں، روانہ ہوگیا۔ راستہ بہت دل کش تھا اور ہر موڑ قدرت کی نت نئی فیاضیوں سے مالا مال تھا۔

کچھ دور نکل کر کیلاش ایک پتھر پر بیٹھ گیا، ایک پیالی چائے پی کچھ دیر سامنے کے منظر سے لطف اٹھایا اور پھر آگے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک باغ میں ایک آدمی تازے سیبوں کو بکس میں بند کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو مسافر کھڑے تھے جن میں ایک دس گیارہ برس کی خوب صورت سی لڑکی تھی۔ وہ دونوں پھل والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

کیلاش ادھر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں پاس سے ایک آواز آئی۔ ''بابو جی تھرماس میں لے چلوں؟'' کیلاش نے مڑ کر دیکھا، بارہ تیرہ برس کی دُبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی اور بڑی بڑی مظلوم اور مایوس آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

تھرماس واقعی کیلاش کو بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے وہ لڑکی کے حوالے کر دیا اور پھر اس فیاضی سے جو قدرت نے اس وادی کے ساتھ دکھلائی تھی پوچھنے لگا۔

''کہاں رہتی ہو؟''

لڑکی نے نیچے کی گھنی تاریکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''وہاں بہت نیچے''

''ماں باپ کیا کرتے ہیں''

''مر گئے''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں''

''کیوں؟''

''بچہ کچھ نہیں کرنے دیتا''

''بچہ؟ کیا تمہارا بچہ بھی ہے؟''

لڑکی اس بدگمانی پر ہنس پڑی اور کہنے لگی

''میرا دو برس کا بھائی ہے جو بہت دق کرتا ہے۔ ہر وقت کھانا مانگتا ہے...... رات کو نہ وہ سونے دیتا ہے اور نہ ڈر........''

ڈرا! اس وادی میں کس چیز سے؟

''میری کٹھریا کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ رات بھر میں ڈرتی رہتی ہوں کہ کوئی آ کر ہم کو کھا نہ جائے''۔

کیلاش کے دل میں دیا اُبل پڑی

''نوکری کرے گی؟''

''کوئی رکھے تو کیوں نہ کروں۔ میں تو بہت محنت سے اس کی سیوا کروں گی۔''

''اچھا میں رکھوں گا تجھے بھی اور تیرے چھوٹے بھائی کو بھی''

لڑکی حیرت زدہ ہو کر کیلاش کو دیکھنے لگی۔

''بابو جی........ سچ؟''

"ہاں سچ .... بالکل سچ"

لڑکی تھوڑی دیر تک حیرت زدہ رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ کیلاش کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور شکر گزاری سے بابو جی بابو جی کرنے لگی۔ اس کے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

رجنی خوشی کے مارے رات کو سو نہ سکی۔ ذرا ذرا دیر کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور ہر بار وہ کروٹ لے کر ٹوٹے کواڑوں کی درازوں سے جھانکتی تھی کہ پہاڑوں کے اوپر آسمان پر صبح کی سفیدی تو نہیں نظر آ رہی ہے۔ آج اس کا روزانہ والا خوف کہ کہیں رات کو کوئی بھیانک شکل والی چیز اس کی کوٹھڑی کے ٹوٹے پھوٹے دروازے سے گھس کر اس کو اور اس کے سب بھائی بہنوں کو سوتے میں کھا نہ جائے۔ دور پہاڑوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کے سامنے سکھ سے بھری ہوئی صبح تھی۔ اور پھر عیش و آرام سے بھرے ہوئے دن اور رات۔

رجنی نے اپنے پانچوں بھائی بہنوں پر نظر ڈالی۔ جو کمبلوں کے نیچے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔

رجنی سوچ رہی تھی کہ ذرا دیر میں صبح ہو جائے گی۔ اور پھر اپنے بھائی بہنوں کو لے کر پانچ سو فٹ کی چڑھائی چڑھ کر بابو جی کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ پھر کیا ہے...... پھر روٹیاں ملیں گی۔ پہننے کو بھی ملے گا اور اوڑھنے کو بھی اور ڈر سے بہت دور کسی کوٹھڑی میں سونے کو جگہ ملے گی۔

آخر صبح قریب آ ہی گئی اور اس کے دو سال کے دبلے پتلے سوکھے سا کھے بھائی للو

نے چیخ مار کر رونا شروع کر دیا۔ آج رجنی نے سستی نہیں دکھلائی اور جلدی سے اسے پیشاب کرالیا۔ ورنہ ہوتا تو یہ تھا کہ وہ یوں ہی دن چڑھے تک پڑا رہتا تھا اور پھر جب اس کا بستر رجنی کو بھیگا ہوا ملتا تھا تو وہ للّو کو دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ آج رجنی نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اسے پیشاب کرالیا بلکہ اسے پیار بھی کیا اور بہلایا بھی۔ یہ چیز للّو کے لیے کچھ اتنی عجیب سی خوشی لے کر آئی کہ وہ رات بھر کی بھوک کو بھول گیا۔ اور اپنی ٹوٹی پھوٹی بولی میں باتیں کرنے لگا۔

جس وقت موتی نگر کی پچّھم کی چوٹیوں پر دھوپ کی پہلی چمک نظر آئی ہے۔ اس وقت تک چھ بچوں کا یہ قافلہ سو فٹ پہاڑ پر چڑھ چکا تھا۔ اور بہت تھک چکا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ تیز تھی اور مخالف تھی اس وجہ سے بچوں کو خالی پیٹ اور چڑھنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ للّو کئی مرتبہ رو چکا تھا اور رجنی کے ہاتھ سے اس پر پٹ بھی چکا تھا۔ رجنی نے ذرا دیر اسے گود میں بھی لیا تھا لیکن بارہ برس کی لڑکی جسے پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو کیسے دو سال کے بچے کو لے کر دور تک جا سکتی تھی اس لیے للّو چل سکے یا نہ چل سکے اسے چلنا تو پڑے گا ورنہ رجنی مار مار کر راستے ہی میں ختم کر دے گی۔ اس وقت تو وہ کچلی ہوئی ناگن کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ اسے سخت کوفت تھی کہ یہ دو سال کا ہڈیوں کا ڈھانچہ میں جہاں جاؤں یا جو کام کروں میری راہ میں حائل رہتا ہے، اب دیکھو اس وقت عیش و آرام کی دنیا صرف چار سو فٹ اوپر ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں کب کی وہاں پہنچ چکی ہوتی۔

رجنی کا غصہ دیکھ کر کلو جو للّو سے دو سال بڑا تھا اور منّی جو چار سال بڑی تھی سہمے

ہوئے تھے اور ہانپ ہانپ کر ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ البتہ تلسی اور رامو رجنی کی طرح تازہ دم تھے بلکہ ان دونوں نے بھی للّو کو باری باری گود میں ذرا ذرا دیر کے لئے اٹھا لیا تھا۔

اس طرح چھوٹے موٹے انسانوں کا یہ چھوٹا قافلہ ڈانٹ اور مار، خوف اور آنسو تھکاوٹ اور ہانپنے، امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ پچاس فٹ اوپر چڑھ گیا۔ اس جگہ رامو کو ایک چشمے کے پاس پڑا ہوا ایک داغی سیب مل گیا۔ لیکن وہ ابھی منہ تک نہیں لے جانے پایا تھا کہ رجنی نے جھپٹ کر اسے چھین لیا اور دانت سے اس کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر للّو کو دیا۔ اور پھر باقی کے دو ٹکڑے کر کے کلو اور منی کو۔

کلو اور منی سیب کا ٹکڑا کھا کر، چشمے کا پانی پی کر تازہ دم ہو گئے اور باتیں کرنے لگے۔

کلو: ''اوپر پتا اور ماں ملیں گی۔''

منی: ''نہیں.........الو.........وہ نہیں.........وہ تو مر گئے''

کلو: ''جو مر جاتے ہیں کیا وہ اوپر بھی نہیں ملتے؟''

مُنّی: (بہت سنجیدگی سے) ''وہ کہیں نہیں ملتے'' ہم لوگ ایک اور بابوجی کے پاس جا رہے ہیں جو پتاجی کی طرح روٹی دیں گے۔ کپڑے دیں گے اور اوڑھنے کو دیں گے۔''

ان دونوں کی باتیں سن کر نہ جانے کیا ہوا کہ رجنی پگھل سی گئی۔ اس نے ان دونوں کو اور پھر للّو کو پیار کیا اور کہا کہ ''اب دھیرے دھیرے اٹھتے بیٹھتے چلیں گے۔ پھر

ڈھارس دینے لگی کہ اوپر پہنچتے ہی بہت سی روٹیاں ملیں گی جن میں گیہوں کی بھی ہوں گی۔ گرم کُرتے اور پیجامے ملیں گے۔ چائے ملے گی، سیب ملیں گے، پھر بابو جی کے ساتھ ہم لوگ ان کے دیس چلے جائیں گے جہاں بہت آرام سے رہیں گے۔''

رجنی جس نے آج تک اس وادی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ اس پار کی دنیا کیسی ہوگی؟ مگر جیسی بھی ہو، وہاں روٹیاں ہوں گی، کرتے پیجامے ہوں گے اور ایسے گھر ہوں گے جن میں ڈر نہ لگتا ہوگا۔

رجنی اب اپنے قافلے کو لے کر مزے مزے اوپر چڑھنے لگی۔ جتنا جتنا اوپر چڑھتی جاتی، اس کی خوشی بڑھتی جاتی۔

رجنی کو معلوم تھا کہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں گھومنے والے دولت مند کسی پہاڑی مرد یا عورت کو رکھ کر اپنے ساتھ میدان میں لے جاتے ہیں جہاں نہ برف پڑتی ہے نہ بھوک ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات دور دور اس کے تصور میں نہ تھی کہ میں بھی ان خوش نصیبوں میں ہوسکتی ہوں اور میرے ساتھ میرے پانچ بھائی بہن بھی۔

سورج اوپر چڑھ رہا تھا اور رجنی بھی اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ اوپر چڑھ رہی تھی آخر ڈاک بنگلہ کی سرخ چھت نے اپنی جھلک دکھلا ہی دی۔

کیلاش چائے پی رہا تھا اور کھڑکی سے صاف ستھری نندا دیوی اور اس کے نیچے کے عظیم الشان پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے نوکر نے آکر خبر دی۔

''کل والی لڑکی آئی ہے''

''اور اس کا بچہ بھی؟''

''ایک چھوڑ پانچ پانچ بچے ساتھ ہیں۔''

''پانچ پانچ''

نوکر: ''جی حضور!''

کیلاش نے باہر آکر دیکھا تو رجنی کھڑی تھی اور اس کے گرد بہت سے چھوٹے بڑے، میلے کچیلے، چیتھڑے چند ھے بچے ناک سے سُڑ سُڑ کر رہے تھے اور کیچڑے سے لت پت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کیلاش نے رجنی کے پاس جا کر سختی سے جواب طلب کیا۔

''یہ سب کون ہیں؟''

رجنی کیلاش کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اس کی سختی کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور چلا کر کہنے لگی۔

''میں ان سب کو لے آئی۔ اب یہ سب آپ کے پاس رہیں گے یہ منّی ہے، یہ للّو ہے وہ رامو ہے وہ کلو ہے وہ تلسی ہے۔''

کیلاش: ''سب تیرے بھائی ہیں؟''

رجنی: جی ہاں دو بھائی ہیں اور دو بہنیں ہیں

رجنی ذرا صاف ستھری تھی اور اس کی صورت میں ایک کشش تھی لیکن بچے تو سڑی گلی چیزوں کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر کیلاش کا جی متلانے لگا۔ اور کل والی

رومانی فیاضی جورات گزر جانے سے باسی ہوچکی تھی حقیقت پسندی سے بدل گئی اور کیلاش سوچنے لگا کہ رجنی کے ساتھ ایک بچہ ہوتا دو ہوتے تو ممکن تھا۔ لیکن اتنوں کو کیسے پالا جاسکتا ہے؟ یہ سب ہمارے چھوٹے سے گھر میں کیسے رہیں گے۔ ان کو کھلایا اور پہنایا کہاں سے جائے گا؟ پھر یہ بہتی ہوئی ناکیں۔ یہ کیچڑ بھری آنکھیں یہ کوئلہ ایسے ہاتھ پاؤں، یہ بو اور میل! کیلاش کی بہنیں بھی باہر نکل آئی تھیں کہ ہم بھی ذرا بھیا کے مہمانوں کو دیکھیں۔

وہ بولیں......

''بھیا ان سب کو لے چلو گے؟''

کیلاش یہ سوال سن کر جھنجھلا گیا اور رجنی سے کہنے لگا۔

''تو نے کل کیوں نہیں بتایا کہ تیرے ساتھ اتنی بڑی فوج ہے سب کو میں کہاں رکھ سکتا ہوں؟''

یہ سن کر رجنی پر بجلی گر پڑی۔ اتنی بڑی مایوسی کا سامنا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا اور آنکھیں اندر ڈوب گئیں مگر منھ سے کچھ نہ نکل سکا۔ اس کے سب بھائی بہنوں کا بھی یہی حال ہوا۔ کلو تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رجنی نے اپنی گھنونی فوج کو نفرت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ایسی نفرت جس کا تقاضا یہ تھا کہ ان سب کو مار ڈالو یا خود مر جاؤ۔

پانچ منٹ کے اندر اندر یہ فوج ناکامی اور نامرادی کو اپنے پھٹے دامنوں میں لے کر پسپا ہوئی لیکن کیلاش کے لیے آسان نہ تھا کہ ان کو یوں رخصت کرتا۔ اس

کی دیا جو مرگئی تھی پھر کراہنے لگی اور پکارنے لگی کہ کچھ تو کرو۔ اس پکار سے نجات پانے کیلئے کیلاش نے رجنی کو پکارا اور دو روپیئے اس کے ہاتھ میں رکھ دیے۔

دو روپیئے...... اس سے بہت کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ رجنی اپنی فوج کو لے کر بازار کی طرف بھاگی اور ایک دوکان کے سامنے سب کو پوریاں کھانے اور کھلانے لگی۔ پہلے آٹھ آنے کی پوریاں لیں، پھر آٹھ آنے کی اور لیں، پھر چار آنے کی اور لیں پھر اور چار آنے کی اس طرح دونوں روپیئے ختم ہو گئے۔ لیکن نہ بھوک گئی اور نہ کھانے کی حسرت۔

دوپہر کے بعد یہ قافلہ خالی ہاتھ نیچے کی طرف تھکے دل اور تھکے پاؤں کے ساتھ اُترنے لگا اور اس طرح کہ بیٹھ گیا تو اٹھنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ صبح جن تاریکیوں سے نکل کے آیا تھا شام کو ان ہی کی طرف جا رہا تھا۔ سورج بھی ڈوبتا جا رہا تھا اور وہ لوگ بھی اترتے جا رہے تھے مگر بالکل خاموشی سے، نہ رونا، نہ ڈانٹنا، نہ اظہار حسرت، نہ ڈھارس گویا یہ سب بچے نہیں بوڑھے تھے، اور وہ بھی ہڈی چمڑے کے نہیں، گودڑ کے بنے ہوئے۔ صرف للو دو ایک بار رویا مگر رجنی کی مارنے نے اس کی بھی آواز بند کر دی۔ سورج ڈوبنے پر یہ لوگ ابی اپنی پرانی کوٹھری میں پہنچے جہاں بھوک تھی اور سردی تھی خوف تھا اور ان تینوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

پہنچتے ہی تھکی ہوئی تلسی نے آہستہ سے کہا۔ ''بھوک لگی ہے'' پھر رامو نے بھی کہا۔ پھر منی اور کلو نے بھی۔ دل کی امیدوں کے ساتھ پیٹ کی پوریاں بھی غائب ہو چکی تھی۔

رجنی بچوں کو اندھیرے اور بھوک اور ڈر کی آغوش میں چھوڑ کر پڑوسیوں کی دیا کا امتحان کرنے نکل کھڑی ہوئی۔

سوالات:

1) کشمیر کی خوب صورت وادی میں پہنچ کر بیمار کیلاش نے کیا محسوس کیا؟

2) کیلاش کے یہاں نوکری ملنے پر رجنی حیرت زدہ کیوں ہو گئی؟ اس نے کس طرح کیلاش کا شکریہ ادا کیا؟

3) رجنی رات کو کیوں نہ سو سکی اور رات بھر کیا سوچتی رہی رجنی کے الفاظ میں لکھیے۔

4) ''رجنی نے اپنی گھنونی فوج کو نفرت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ایسی نفرت جس کا تقاضا یہ تھا کہ ان سب کو مار ڈالو یا خود مر جاؤ''۔ اس جملے میں مصنف نے رجنی کے کن جذبات کو پیش کیا ہے؟

5) کیلاش کے انکار سے رجنی کے اوپر بجلی کیوں گر پڑی؟

6) پہاڑ چڑھتے وقت اور پھر پہاڑ سے اترتے ہوئے رجنی اور اس کے بہن بھائیوں کے جذبات کیا تھے؟

7) ''رجنی بچوں کو اندھیرے اور بھوک اور ڈر کی آغوش میں چھوڑ کر پڑوسیوں کی دیا کا امتحان کرنے نکل کھڑی ہوئی''۔ اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

پانچ اشرفیاں

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

''اگر اس سرزمین میں ایسے غریب اور محتاج باقی ہیں جن کو محنت و مشقت کے باوجود دن بھر میں ایک وقت سے زائد کھانا میسر نہیں ہوتا تو میں سمجھتی ہوں کہ گذشتہ پچاس سال میں میرے والد میرے شوہر اور میں نے خود بھی اس ملک کی سرسبزی و شادابی اور ہر طبقہ کی فلاح کیلئے جو کوششیں کی ہیں وہ سب رائگاں گئیں۔ رعایا کی خوش حالی سلطنت کے بقاو استحکام کی ضامن ہوتی ہے۔ میں اپنے نورِعین کے ہاتھ میں اس وقت تک حکومت کی باگ نہیں دے سکتی جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ سلطنت میں امن و امان ہے رعایا خوش حال ہے۔ اور اہل دربار کے اخلاق و عادات اس درجہ قابل اعتماد ہیں کہ کسی بیرونی حملے اور سازش کا احتمال تک نہ ہو۔

حیدر آباد کے مشہور آنند محل میں ملکۂ جہاں خدیجۂ زماں حیات بخش بیگم نے گولکنڈے کے وزرائے خاص سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ وزرائے ملکہ کی ترقی عمر و اقبال کیلئے دعائیں دیں اور دست بستہ عرض کیا:

''حضور ہم سب خانہ زادوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی پادشا بیگم اور اپنے جواں بخت عمر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے قدموں پر اپنی

جان تک نثار کرنے کیلئے ہر وقت حاضر ہے۔ پھر بھی اگر ہم میں سے کسی کی نسبت ملکۂ زماں کو شبہ ہو تو ہم سب تیار ہیں کہ اس کو آپ کے ادنیٰ اشارے پر دربار سے نکال باہر کر دیں۔ وفاداری ہمارا شیوہ ہے اور اپنے آقا کے لئے اپنی جان پر کھیلنا ہمارا پیشہ!''

ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

''مجھے تو امرا سے زیادہ غریبوں کا خیال ہے۔ تمہارے مرحوم بادشاہ کا مقولہ مجھے ہر وقت یاد آتا رہتا ہے کہ امیر امرا ہمیشہ طاقت وروں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کے برخلاف غربا ہر وقت اپنے ضمیر کے تابع اور ایمان وایقان کے پکے ہوتے ہیں اور ان کا جذبۂ وفاداری ہمیشہ قابل اعتماد رہتا ہے۔ اسی لئے میرا اور میرے آبا و اجداد کا یہی طریقہ رہا ہے کہ عوام اور غریبوں کی طرف زیادہ توجہ کی جائے اور خلق اللہ کی آسائش اور رفاہ عام کے کام ہمیشہ جاری رکھے جائیں۔

ملکہ کے ان اعلیٰ خیالات کا وزرا پر خاص اثر ہوا۔ وہ بالکل خاموش تھے ان میں سے ایک محمد سعید اردستانی نے عرض کیا کہ۔

''ہم تمام جاں نثار اس وقت خلق اللہ ہی کی نمائندگی کرنے کیلئے ملکہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہیں۔ تمام ملک کی دلی خواہش یہی ہے کہ دودمان قطب شاہیہ کے چشم و چراغ سلطان عبداللہ ظل اللہ زمام حکومت سنبھالیں۔

ملکہ نے فرمایا:

''میری بھی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ اپنے فرزند جگر بند کو اس شاندار سلطنت پر کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں خدا وہ دن جلد

لائے کہ میری یہ تمنا بر آئے۔ بارگاہِ ربّ العزت میں شب و روز یہی دعا کرتی ہوں میں تمہاری خواہشات معلوم کر کے خوش ہوئی اور انشاء اللہ بہت جلد رعایا کی حالت اور ملک کے امن و امان کے متعلق بھی تجربہ کرلوں گی۔ اگر یہ کامیاب ثابت ہوا تو تمہاری اور میری ہم سب کی دلی آرزو بہت جلد پوری ہو سکے گی۔

محمد سعید نے دست بستہ عرض کیا:

''اگر حضور اجازت عطا فرمائیں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے کہ رعایا تو ملک و مالک پر فدا ہے ان کی خوش حالی کا چرچا دور دور تک ہے۔ دوسرے ملکوں میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ گولکنڈے میں ہن برستے ہیں اور وہاں کا ہر پتھر ہیرا بن کر چمکتا ہے۔ بندگان عالی جو تجربہ کرنا چاہتے ہیں وہ بہت مشکل کام ہے حضور ہم پر اعتماد فرمائیں اور یہ فدوی ہر طرح یہ امر ثابت کرنے کیلئے تیار ہے کہ امرا اور رعایا کی طرف سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوگی جو ملک کے مفاد اور مالک کی مرضی کے خلاف ہو۔''

ملکہ نے جواب دیا:

'تمھارے جذبۂ وفاداری اور جان نثاری کے اظہار سے اطمینان ہوا مگر میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ عوام کی حالت کا اندازہ کرنا میرے لیے ضروری ہے تم پر وہ ذمہ داری عائد نہیں ہے جو ایک بادشاہ پر ہوتی ہے۔ بادشاہ کے نزدیک امیر اور غریب سب برابر ہیں۔ اس کی نظر آفتاب کی شعاع کے مانند ہے جو پست و بلند ہر جگہ یکساں پڑتی ہے۔ امیر کہاں غریبوں کا خیال رکھ سکتے ہیں جب کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کی ترقی اور خوش حالی کو دیکھ نہیں سکتے۔ ممکن ہے کہ کسی سلطنت کے

وزیروں یا امیروں کو وہاں کے غریبوں کی ذہنی و معاشی حالت کے متعلق تجربے کرنا مشکل معلوم ہو مگر بادشاہ کیلئے یہ بہت آسان کام ہے۔ خدا چاہے تو میں تم سب کو دس روز کے اندر اندر ہی اپنے تجربہ کے نتیجے سے مطلع کر دوں گی اور اسی نتیجے پر میری اور تمہاری خواہش کی تکمیل کا انحصار ہے۔''

اسی روز شام میں دولت خانۂ عالی سے خواجہ سراؤں اور ماماؤں نے چاندی کے ایک تھالے میں پانچ اشرفیاں اور چاندی کے مختلف اشیا لاکر چار مینار کے وسط میں سر راہ رکھ دیا اور شہر میں شہرت مچ گئی کہ یہ سامان سلطان عبداللہ قطب شاہ کے صدقے کا ہے۔

آٹھ دن آٹھ راتیں گذر گئیں۔ نویں روز اعلیٰ الصبح ملکہ نے محل کی ایک اصیل کو روانہ کیا کہ دیکھ آئے کہ اس سامان صدقہ کا کیا حشر ہوا۔ اصیل نے واپس آ کر عرض کیا کہ پانچوں اشرفیاں اور جملہ سامان بالکل اسی طرح اسی جگہ رکھا ہوا ہے جس جگہ پہلی دفعہ رکھا گیا تھا۔

ملکہ نے وزرائے سلطنت کو طلب کیا اور فرمایا:

''میں نے جس تجربے کا ذکر کیا تھا آج اس کا نتیجہ برآمد ہو گیا۔ رعایائے سلطنت کی حالت ہر طرح قابل اطمینان ہے اور اب تم سب مطمئن ہو جاؤ کہ سلطان کو زمام حکومت سپرد کر دی جائے گی۔''

سب وزرا حیرت زدہ تھے۔ ان میں سے ایک نے جرأت کر کے عرض کیا:

''ملکہ زمانی کی فہم و فراست ہمارے وہم و خیال کی رسائی سے بالا ہے۔ ہم کو حیرت ہے کہ حضور نے ایسا کیا طریقہ اختیار کیا ہو گا جو اتنی قلیل مدت میں حیدر آباد

جیسے وسیع ملک کی رعایا کی ذہنی و معاشی حالت سرکار کے سامنے بے نقاب ہوگئی!

ملکہ نے پوچھا:

''کیا اس اثنا میں کبھی تم میں سے کسی کا گذر چار مینار کی طرف ہوا؟''

وزرا نے متفق ہو کر کہا:

''کسی وقت کیا معنی۔ حضور ہم تو دن میں کئی بار ادھر ہی سے گذرتے ہیں!''

''پھر تمھیں وہاں کی کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی؟''

وزرا آپس میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ محمد سعید نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ:

''میں نے دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ حضرت ظلِّ سبحانی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا صدقہ ملکہ نے چار مینار کے قریب رکھوایا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

سب خاموش تھے ملکہ نے فرمایا کہ:

''تم سلطنت کے ذمہ دار افراد ہو اور تمھیں کچھ خبر نہیں؟ بہتر یہ ہے کہ اسی وقت سب جا کر دیکھ آئیں۔''

قطب شاہی وزرا نے چار مینار کے قریب جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ملکہ نے چند روز قبل بادشاہ کا صدقہ بھیجا تھا اور اس وقت سے کوتوالی کے پہرے کو یہاں سے برخواست کر دیا ہے۔ وزیروں نے صدقے کی چیزوں کا معائنہ کیا اور دولت خانۂ عالی میں واپس ہو کر ملکہ سے جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔

ملکہ نے فرمایا:

''آج نواں روز ہے کہ میں نے صدقہ رکھوا دیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں خدا کے فضل سے اس قابل ہوں کہ اپنی موروثی سلطنت کو اپنے فرزند دلبند کے سپرد کر دوں۔ میں نے اب تک اس امانت کی نہایت دیانت کے ساتھ حفاظت کی اور اب ایک ایسی حالت میں اس امانت کو نوجوان بادشاہ کے سپرد کر رہی ہوں کہ آئندہ کوئی مجھ پر کسی طرح کا الزام نہیں لگا سکتا۔ میں اب اطمینان خاطر کے ساتھ اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو کر حیات نگر میں گوشہ نشین ہو جاتی ہوں اور اپنے فرزند، اپنی سلطنت اور تم سب کو خدا اور اس کے رسول کی حفاظت میں چھوڑتی ہوں۔''

بعد میں ملکہ نے جملہ اراکین سلطنت اور امرا دربار سے حلفی وعدے لیے کہ اس جواں سال بادشاہ کی اطاعت سے کبھی منحرف نہ ہوں گے اور ہر وقت اپنی جان تک نثار کرنے کیلئے تیار رہیں گے۔

سلطان عبداللہ کے با اقتدار ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی محمد سعید نے بادشاہ کے دل میں کچھ ایسی جگہ پیدا کر لی کہ بالآخر میر جملہ کے خطاب اور صدر اعظمی کے عہدے پر سرفراز کیا گیا اور سلطنت کے جملہ امور اسی کے قبضۂ اقتدار میں آ گئے۔ وہ چند سال بعد ہیروں کے لالچ میں گولکنڈے سے نکلا اور توسیع سلطنت کے بہانے سے تمام شاہی افواج کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔

اس اثنا میں بادشاہ میر جملہ کی بعض مفسدانہ حرکات سے ناراض ہو گیا تو اس بدکیش نے شہزادہ اورنگ زیب کو گولکنڈے پر دھوکے سے حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔

چناں چہ جس وقت مغل فوجیں قطب شاہی سلطنت کے حدود پر منڈلا رہی تھیں ضعیف العمر ملکہ حیات بخش بیگم کو گوشہ نشینی چھوڑ کر پھر حیدر آباد آنا پڑا۔ انھوں نے میر جملہ کے ہاں اپنے ملازمین خاص روانہ کیئے اور کہلا بھیجا کہ شاہی فوجیں لے کر فوراً حیدر آباد چلے آئیں اور اپنے اس حلفی عہد و پیمان کو پورا کرے جو سلطان کے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے وقت اس نے ملکہ سے کیا تھا۔

احسان فراموش میر جملہ نے جواب دیا کہ:

''شاید ملکہ کو مرحوم سلطان محمد قطب شاہ کا وہ مقولہ یاد نہیں رہا کہ امرا ہمیشہ طاقت وروں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا ضمیر سیاست کا غلام ہوتا ہے۔

دغا باز میر جملہ کا یہ جواب ملکہ کو اس وقت ملا جب اورنگ زیب، حسین ساگر کے کنٹے تک پہنچ چکا تھا اور سلطان عبداللہ دھوکے میں آ کر اس کے استقبال کیلئے نکلا تھا جب راستے میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مغل سوار اس کو قید کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں تو وہ فوراً محل کی طرف پلٹا۔ لیکن اس اثنا میں مغل اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور وہ ان کے نرغے میں پھنس جاتا اگر حیدر آباد کے غرباء ان مغلوں کا راستہ نہ روک دیتے۔

عبداللہ قطب شاہ کی اس نازک حالت کی اطلاع قرب و جوار کی گلیوں میں برقی رو کی طرح دوڑ گئی اور کثرت سے اہل شہر بادشاہ کو بچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں اور دوکانوں سے نکل پڑے۔ اس خدائی فوج نے مغلوں کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ کئی غریب اہل شہر اپنے ملک و مالک کی راہ میں شہید ہو گئے اور سینکڑوں زخمی

ہوئے۔ اس اثنا میں بادشاہ صحیح وسالم دولت خانہ عالی میں پہنچ کر سرنگ کے ذریعہ قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوگیا۔

جب ملکہ کو معلوم ہوا کہ شہر کے غریبوں نے کس طرح اپنے بادشاہ کو بچالیا تو اس کی زبان سے اس کے مرحوم شوہر کا وہ جملہ بے ساختہ نکل پڑا۔

''غریب ہر وقت اپنے ضمیر کے تابع اور ایمان وایقان کے پکے ہوتے ہیں اور ان کا جذبۂ وفاداری ہمیشہ قابل اعتماد ہوتا ہے۔''

اس نے شہیدانِ وطن کے ورثا اور تمام زخمیوں کو فی کس پانچ پانچ اشرفی انعام عطا کیا۔

سوالات:

1) ملکہ حیات بخش بیگم نے گولکنڈے کے وزیروں سے کیا کہا؟

2) اپنے ملک کے عوام کی حالت کا اندازہ لگانے کیلئے ملکہ نے کیا تجربہ کیا؟

3) ملکہ نے عوام کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کس کے حوالے کی؟

4) گولکنڈے کے وزیر محمد سعید نے کیا سازش کی؟

5) حیدرآباد کے غریبوں نے مغلوں کا راستہ کس طرح روکا؟

6) بادشاہ کے صحیح سلامت لوٹ آنے پر ملکہ نے کیا کیا؟

7) اس کہانی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

نادان ٹیچر

عصمت چغتائی

''برسو رام دھڑا کے سے
بڑھیا مرگئی فاقے سے''

ہم سب بچے مل مل کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ کسی نے رائے دی پُرانے کپڑے کی ایک بڑھیا بنا کر دھوپ میں رکھ دو اور مندرجہ بالا منتر چلاّ چلاّ کر پڑھو تو پانی برسنے لگے گا۔

شاید اللہ میاں نے ہماری سن لی، کالی کالی گھٹائیں ہاتھیوں کی طرح جھومتی گرجتی اٹھیں اور پل بھر میں موٹی موٹی بوندیں پٹاخ پٹاخ خشک زمین پر گرنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھنا دھن بارش شروع ہوگئی۔

''اب تو ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے۔'' خوشی سے ہماری گھگی بندھی جا رہی تھی۔ اُف جب سے یہ ماسٹر صاحب آئے تھے ایک دن ناغہ نہیں کی تھی، جوں ہی گھڑی کی سوئی چار پر پہنچی ماسٹر صاحب اُفق پر نمودار ہو جاتے۔ ان کا شاید کوئی سگا سوتیلا بھی نہ تھا جو خوش قسمتی سے کبھی بیمار پڑتا یا مرجاتا اور وہ نہ آتے تھے۔ تو ماسٹر صاحب پتلے بانس جیسے مگر کیا مجال جو کبھی بیمار پڑ جائیں، میرا مطلب ہے مہلک طور پر

بیمار پڑ جائیں کہ پلنگ سے نہ ہل سکیں۔ ہلکے بخار میں تو وہ چوکنے والے نہ تھے۔ سڑ پٹر کرتے آن پہنچتے۔ وہیں برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے اور اتنا پڑھاتے اتنا پڑھاتے کہ ہم لوگ کراہ اٹھتے۔

وہی ہوا، ہماری دعا پوری ہوگئی۔ بارش جی چھوڑ کر برسنے لگی۔ چار بج گئے اور ماسٹر صاحب غائب۔ مارے خوشی کے ہم لوگ برآمدے میں دھما چوکڑی مچانے لگے۔ کوئی پلنگ پر کھڑا ہو کر کودنے لگا۔ بڑا مزہ آتا ہے بان کے پلنگ پر اچھلنے میں۔ دو چار تخت پر گھمسان کی کشتی لڑنے لگے۔ اماں نے پریشان ہو کر سر پیٹ لیا۔ اللہ پاک بغیر ماسٹر کی دنیا کتنی حسین ہوتی ہے۔ تو پھر تو نے یہ خطرناک شے پیدا ہی کاہے کو کی۔ کیا سانپ، بچھو کافی نہ تھے تیرے بندوں کا ناطقہ بند کرنے کو جو تو نے اوپر سے ماسٹر اور ماسٹرنیاں پیدا کردیں۔

مگر ہماری اچھل کود پر ایک دم اوس پڑ گئی جب ہم نے دیکھا ماسٹر صاحب پائنچے چڑھائے پانی میں چھپک چھپا کرتے چلے آرہے ہیں، اس وقت ہمیں قیامت کے برحق ہونے کا پکا یقین ہوگیا۔ ''بچّو آج بارش کی وجہ سے ذرا دیر ہوگئی۔ میں تم لوگوں کو ایک گھنٹہ دیر تک پڑھاؤں گا۔'' اور چونکہ ماسٹر صاحب کے پاس گھڑی نہیں تھی اس لیے بجائے ایک کے ڈیڑھ گھنٹے تک پڑھاتے چلے گئے۔

اور ہم پڑھتے چلے گئے۔ اسی طرح ٹیچروں کی موت اور بیماری کا ارمان دل میں لئے بی۔ اے اور پھر بی ایڈ کے بعد خود ٹیچر بننے کی نوبت آ گئی۔ بڑی عرضیوں اور سفارشوں کے بعد بڑی اچھی سی نوکری ملی۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی نوکری مستقل بھی

نہ تھی۔ کام بھی زیادہ تھا۔ گھر کے حالات سے مجبور ہو کر یہ نوکری بھی کرنی پڑی۔ کچھ تو سہارا رہے گا۔

جب پہلے دن کلاس میں قدم رکھا تو دل کانپ رہا تھا۔ جیسے اپنے استادوں کی بیماری اور موت کی دعائیں مانگی تھیں آج یہ بچے میری موت کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔ میری صحت بھی بدقسمتی سے اچھی ہے اور جب روز روزان کی دعا پوری نہ ہوگی تو ان کے ننھے ننھے دل ٹوٹ جائیں گے۔ کاش میں کبھی تو بیمار پڑسکوں تاکہ بچوں کی آنکھوں میں جو مجھے دیکھ کر مایوسی ہو جاتی ہے وہ نہ دیکھوں۔

''بچو...... آج کا دن بڑا خوب صورت ہے۔ کیوں ہے نا'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جی...... جی...... ہاں'' بہت سی آوازیں چہکیں۔

''آج تو پڑھنے کے بجائے پکنک کو جاتے تو مزہ آتا'' میں نے ہمت کی۔

''جی ہاں...... ٹیچر پکنک...... پکنک''

''شی...... آہستہ بولو بچو...... کسی نے سن لیا تو آفت آجائے گی کہ پڑھنے کی بجائے ہم لوگ پکنک منا رہے ہیں''۔

بچے فوراً دھیمی آواز میں بولنے لگے۔ ''ٹیچر پکنک...... ٹیچر پکنک''

''سوال یہ ہے کہ کہاں جائیں پکنک کے لیے؟''

''نہر کے کنارے، گارڈن میں...... قلعہ......'' مختلف آوازیں اٹھیں

''شی شی...... آہستہ بولو کہیں دوسرے بچوں نے سن لیا تو...... وہ بھی

کہیں گے کہ ہمیں بھی لے چلو۔ میں تمہاری ٹیچر ہوں اسلیے صرف تمھیں لے جا سکتی ہوں۔ ہاں تو کچھ سواری کا انتظام بھی ہو سکتا ہے تم لوگوں سے"

"نہیں ....جی نہیں" بچے پریشان ہو گئے۔

"چہ ارے تو پھر کیسے جائیں گے؟"

بچوں کے منہ اُتر گئے۔

"ایک ترکیب ہے۔" بڑی رازداری سے میں نے کہا" کہ کلاس کے پیچھے جو میدان ہے وہاں چلیں۔" مارے خوشی کے بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔

"مگر ہاتھ میں کتابیں لیتے چلیں گے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم پڑھ نہیں رہے ہیں۔"

اس دن کچھ زیادہ پڑھائی تو ہوئی نہیں لیکن بچّوں کے دل سے قطعی دہشت نکل گئی اور میں نے سوچا اب یہ میرے مرنے کی دعائیں کم مانگیں گے۔

دوسرے دن کلاس میں داخل ہوتے ہی میں نے بڑا غمگین چہرہ بنالیا۔ بچے بھی کچھ پریشان ہو کر کھسر پھسر کرنے لگے۔

"بچو میں بہت پریشان ہوں آج مجھے بڑا افسوس ہے کہ........ میں بہت بری ٹیچر ہوں۔ آج بھی میرا دل بالکل پڑھانے کو نہیں چاہتا کاش میرا بس چلتا تو آج بھی پکنک کو جاتے ویسے تم کہو تو میں چلنے کو تیار ہوں، مگر ایک بات ہے۔"

"جی ....کیا بات ہے ٹیچر........" بچے بزرگانہ انداز میں بولے

"اگر پڑھانے کے بجائے میں یوں تمہارا وقت برباد کرتی رہی تو ظاہر ہے مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔"

''ہائے ...... اف ...... نہیں۔'' مختلف آوازیں گونجیں۔

''قطعی نکال دیا جائے گا۔ تمہارے والدین تمہاری فیس اس لیے نہیں دیتے کہ میں تمھیں سیریں کراؤں۔ پڑھانے کیلئے دیتے ہیں۔ کیوں ہے نا''۔

''مگر میں کیا کروں تمہارا پڑھنے میں دل لگتا ہے مگر میرا دل پڑھانے میں بالکل نہیں لگتا۔ تم اتنے پیارے ہو بس تمہارے ساتھ تو کھیلنے کو دل چاہتا ہے۔''

بچے شرما کر مسکرائے اور واقعی پیارے بننے لگے۔

''کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ دل لگے میرا۔'' میں نے مسکین صورت بنائی۔ بچے کھسر پھسر کرنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بدشوق ٹیچر سے کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

''ٹیچر ......'' ایک بچی چہکتی ہوئی اٹھی

''جی'' میں نے نہایت فرماں برداری سے کہا

''آپ ہمیں سبق دیجیے ہم خود پڑھ لیں گے''

''سچ؟ ...... شکریہ بچو ...... اُف مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا آج کا سبق ہے کیا۔ تمھیں یاد ہو تو نکالو۔'' بچوں نے فوراً سبق نکال لیا۔

''اتنا سمجھ لو میرا بالکل دل گھبرا رہا ہے مگر تمہاری خاطر پڑھائے دیتی ہوں۔ مگر ایک شرط پر''۔

''جی ...... کیا شرط۔'' بچے ہنسے

''آدھا پڑھاؤں گی اور آدھا وقت باہر چل کر کیاریوں میں پانی

دیں گے، ٹھیک؟''

''ٹھیک...... بالکل ٹھیک۔''

نہ جانے کب پیریڈ ختم ہوگیا بچوں نے اس قدر انہماک اور ذمے داری سے پڑھا کہ گھنٹہ بھی سنائی نہ دیا۔ جب دوسری ٹیچر نظر آئیں تو ہم چونکے۔

''لو گھنٹہ ختم بھی ہوگیا۔'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا ''تم لوگ بڑے چالاک ہو مجھے پھسلا کر پورا گھنٹہ پڑھ لیا اور بچے میرے بچپنے پر چالاک بزرگوں کی طرح ہنسنے لگے

کچھ ہی دن میں بچوں کو مجھ سے بڑی ہمدردی ہوگئی۔ بے چاری ٹیچر کا پڑھانے میں دل نہیں لگتا۔ کتنی عجیب ٹیچر تھی۔ وہ لوگ مجھے طرح طرح سے پھسلاتے۔ بزرگوں کی طرح نصیحت کرتے۔ پکنکوں کا لالچ دیتے۔ پڑھائی کا زیادہ سے زیادہ بوجھ خود اٹھاتے اور جب واقعی پکنک پر جاتے تو میری طرف ایسے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہیں ''شریر ٹیچر، اب تو خوش ہو۔'' کہتے ہیں ٹیچر بچوں کی ماں کی جگہ ہوتی ہے۔ مگر میری عجیب حالت تھی۔ میرے بچے الٹا میرا لاڈ کرنے لگے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اگر میرے اوپر رحم کھا کر مجھے پڑھانے پر مجبور نہ کریں تو میں فوراً برطرف ہو جاؤں گی۔

ایک دن مجھے کچھ حرارت سی ہوگئی۔ میں نے چھٹی لے لی۔ اپنے کلاس کے بچوں کو پرچہ بھیجا کہ ''شکر ہے کہ آج میں بیمار ہوں اور چھٹی مل گئی۔'' بچے بھلا ماننے والے تھے۔ جیسے ہی گھنٹہ شروع ہوا، بھیڑ کی بھیڑ میرے کمرے میں ٹوٹ پڑی۔ اتفاق سے کھیل کا گھنٹہ تھا، بس فوراً مجھے مریض تصور کر کے تیمارداری شروع کر دی۔

کوئی آٹھ بچوں نے تھرمامیٹر لگا کے دیکھا۔ آٹھ دس باورچی خانے میں گھس کر سوپ تیار کرنے لگے۔ چھے سات نے ایک دم دوا کی شیشی پر حملہ کر دیا اور میں نے بن کر منہ چھپا کر دوا پینے سے انکار کر دیا تو بڑے پیار سے پھسلا پھسلا کر دوا پلائی۔ میں نے سیب کھانے سے صاف انکار کر دیا کہ ''یہ جادو کا سیب ہے کھاتے ہی چڑیا بن کر اُڑ جاؤں گی۔'' تو بچے میری نادانی پر بہت ہنسے اور جب انھوں نے سیب کھا کر مجھے یقین دلایا کہ سیب کا جادو انھوں نے ختم کر دیا تب میں نے سیب کھایا۔

گھنٹہ ختم ہو گیا بڑی مشکلوں سے بچے زبردستی کلاس لے جائے گئے اور خالی گھنٹہ پھر آن دھمکے۔ ضد کر کر کے زیادہ سے زیادہ سبق لیا اور مجھے مرعوب کرنے کیلئے وقت سے پہلے ہی کورس ختم کر ڈالا۔ ایک دن میں نے ان سے بڑھ چڑھ کر کہا ''اگر تم اتنی ہی تیزی سے سبق یاد کرو گے تو میں تمہیں کیسے پڑھا سکوں گی'' بچے بڑے معنی خیز انداز سے ہنسے اور پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے پڑھنے لگے۔ پتا نہیں ٹیچروں کو بچوں کی شرارت پر کیسے غصہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرے بچے تو میری کاہلی اور شرارتوں اور پڑھانے سے جی چرانے کی عادت کو بڑے پیار سے مسکرا کر معاف کر دیا کرتے تھے۔ ٹیچر بچوں کی ماں کی جگہ ہوتی ہے مگر مجھے تو کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا میں بچہ ہوں اور بچے بڑے مفکر اور سمجھ دار ہیں۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اگر انھوں نے محنت نہ کی تو نادان ٹیچر اسکول سے نکال دی جائے گی۔ ذمے داری کے احساس نے انھیں کس قدر بزرگ اور سنجیدہ بنا دیا۔ انھیں فخر تھا کہ بجائے اس کے کہ میں ان کی فکر کروں وہ میری فکر میں گھلتے ہیں۔ اور جب امتحان کے بعد میری کلاس کا

سب سے اچھا نتیجہ ہونے کی وجہ سے پرنسپل صاحب نے میری تعریف کی تو بچوں نے بڑے مشفقانہ انداز سے مسکرا کر میری طرف دیکھا جیسے کہتے ہوں۔ ''اچھے ٹیچر ہمیشہ بچوں کا کہنا مانا کرتے ہیں۔''

سوالات:

1) بچّے کیوں بارش کی دعا کر رہے تھے؟
2) ماسٹر صاحب کیوں دیر سے آئے؟
3) افسانہ نگار نے خود ٹیچر بننے کے بعد کیا کیا؟
4) افسانہ نگار نے کیا طریقہ اختیار کیا؟
5) اچھے ٹیچر اپنے بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔
6) اس کہانی میں کس بات پر زور دیا گیا؟

بند کتاب

امیر النساء

ملیحہ کی خوش مزاجی اظہر من الشّمس تھی۔اسکی فراخ پیشانی پر کسی نے بل نہیں دیکھے۔جب بھی کسی نے دیکھا اسے مسکراتے ہی دیکھا۔کسی کے ساتھ اس کی تلخ کلامی نہیں ہوتی۔مخاطب کے مزاج کو سمجھنے کا اسے پورا سلیقہ تھا۔کبھی کسی نے اسے کسی کے ساتھ الجھتے نہیں دیکھا۔اپنے کام سے کام رکھنے والی بڑی خوش مزاج لڑکی تھی میں سوچتی کہ کاش میرا مزاج بھی ملیحہ کی طرح ہوتا۔اس کی سی شگفتہ مزاجی تھوڑی سی مجھے بھی مل جاتی۔مگر یہ تو میری سوچ تھی بھلا اس جیسا تحمل اور خوش مزاجی میں کہاں سے لا پاتی کیونکہ ذرا سی کوئی بات میرے مزاج کے خلاف ہوئی میں پٹری سے اترنے لگتی جب کہ بڑی سے بڑی بات پر بھی ملیحہ کی پیشانی پر شکنیں تک نہیں پڑتیں ملیحہ ویسے تو میری خالہ زاد ہے۔اتفاق سے میری اور اس کی سسرال پاس پاس ہونے کی وجہ سے اکثر ملاقات رہتی۔میں کبھی کبھار ہی اس کی سسرال جا پاتی جب کہ وہ بلا ناغہ ہمارے ہاں چلی آتی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرے ساس سسر کافی روشن خیال اور وضع دار ہیں مہمانوں کے ساتھ ان دونوں کا سلوک پرخلوص ہوتا ہے اس لئے ملیحہ

بلا جھجک ہمارے ہاں چلی آتی ہے جب کہ مجھے اس کے ہاں کبھی کبھی جاتے ہوئے بھی جھجک مانع رہتی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ملیحہ نے کبھی اصرار کر کے مجھے اپنے گھر نہیں بلایا۔ ملیحہ کی آمد سے میری سسرال والے خوش ہو جاتے کیونکہ وہ سب کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتی جیسے ان کی خاص عزیزہ ہوں۔ میری ساس چونکہ ایک دیندار خاتون ہیں انھیں احادیث اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات سننے کا بہت شوق رہتا ہے۔ ملیحہ پر مجھے اس لئے بھی رشک آتا ہے کہ احادیث اور واقعات بیان کرنے میں اسے ملکہ حاصل ہے۔ اتنے اچھے پیرائے میں اسلاف کے واقعات سناتی کہ جی چاہتا کہ وہ سناتی رہے، ہم سنتے رہیں۔ باتوں کے درمیان کوئی بھی موضوع نکل آتا اسے برمحل کوئی حدیث یا واقعہ یاد آجاتا۔ جب تک ہمارے ہاں ہوتی جی چاہتا کہ وہ کسی نہ کسی موضوع پر کچھ نہ کچھ بولتی رہے۔

گرمیوں کی لمبی دوپہریں ویسے بھی اکتا دینے والی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں دوپہر کا کھانا بھی نماز سے پہلے کھالیا جاتا ہے۔ کافی دیر ستانے کے باوجود گھڑی کی سوئی تین یا ساڑھے تین سے آگے نہیں بڑھتی۔ میرے شوہر اور سسر دوپہر کا کھانا آفس میں ہی کھالیا کرتے ہیں۔ ان دونوں کی واپسی شام چھ بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔ دوپہر سے سہ پہر تک میں اور اماں اکٹھی بیٹھ کر کسی نہ کسی موضوع پر تبادلہ خیال کرتی رہتیں۔

چونکہ اماں کو احادیث سننے اور سنانے کا کافی شوق ہے اسلئے وہ کچھ نہ کچھ کہتی اور سنتی رہتیں۔ ہماری پڑوسن عائشہ آپا اکثر اس وقت ہمارے ہاں تشریف لاتیں۔ کیونکہ وہ خود بھی اس وقت فارغ ہوتی تھیں۔ اور ہماری فراغت کا بھی انھیں علم ہوتا تھا۔ آج بھی

اتفاق سے عائشہ آپا آئی ہوئی تھیں۔ حسب معمول کسی موضوع پر زوردار بحث چل نکلی اور عائشہ آپا اماں کے نظریہ کے خلاف اپنے موقف پر ڈٹ گئیں۔ اماں چونکہ ایک سادہ مزاج خاتون تھیں۔ انھیں زمانے کے چلن کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ جیسی خود تھیں دوسروں کو بھی ویسا ہی پرخلوص سمجھتی تھیں۔ عائشہ آپا کہنے لگیں۔

''خون سفید ہوگیا ہے آپا لوگوں کا (وہ میری ساس کو آپا کہتی ہیں) نہ رشتوں کا پاس ولحاظ رہ گیا ہے۔ نہ آپس میں خلوص ومحبت، خودغرضی اتنی بڑھ گئی ہے کہ بھائی بھائی کی حق تلفی کررہا ہے۔ روپیئے پیسے کیلئے اپنے اپنوں کے دشمن بن گئے ہیں۔ کسی کوکسی سے بے غرض محبت نہیں رہی، سب غرض کے بندے بن گئے ہیں۔ کاش اس مادی دور میں کوئی بندہ تو ایسا دکھائی دیتا جو خالص اللہ کے لئے دوستی اور اللہ کے لئے دشمنی کرے۔''

عائشہ آپا نے اپنے خیالات کا اظہار تاسف بھرے لہجے میں کیا۔

''تم اس قدر مایوسی کی باتیں مت کرو عائشہ ابھی دنیا بے غرض محبت کرنے والوں سے خالی نہیں ہوئی۔

''اماں نے حسب معمول مسکراتے ہوئے کہا''۔

''مجھے تو اس بھری دنیا میں کوئی ایسا بندہ نظر نہیں آتا جو کسی سے۔ بے غرض محبت رکھتا ہو۔ بنا فائدے کے کوئی کسی سے دوستی بھی نہیں کرتا آپا آپ تو بڑی سیدھی ہیں''۔

عائشہ آپا نے اماں کی باتوں کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

''میری نظروں سے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو کسی سے محبت کرنا تو درکنار

دوسروں کی خوشیوں سے بھی جلتے ہیں''۔

عائشہ آپا اپنا تجربہ بیان کر رہی تھیں شاید، مگر اماں کو قائل کرنے میں ناکام رہیں۔مگر اماں نے ان کی آنکھوں میں بس بے یقینی کی تصویر دیکھ لی اور کہنے لگیں۔

''تمہارا کہنا بھی کسی قدر ٹھیک ہے مگر بات میری بھی سچ ہے۔اس دنیا میں یقیناً ہر قسم کے لوگ بستے ہیں مگر اچھے لوگوں سے بھی ابھی دنیا خالی نہیں ہوئی ورنہ قیامت نہ برپا ہو جاتی۔''

اماں اس حد تک لوگوں سے مایوس نہیں ہوئی تھیں۔

''ہاں جو اچھے ہیں سو اچھے ہیں۔میں انھیں برا نہیں کہتی۔مگر کچھ لوگ جنکے بارے میں میرا یہ اندازہ ہے وہ جیسے باہر سے نظر آتے ہیں ویسے اندر سے نہیں ہوتے۔نعلی چہرہ لگائے گھومتے ہیں۔ایسے لوگ میری برداشت سے باہر ہوتے ہیں۔

عائشہ آپا نے اپنا تلخ نظریہ پیش کیا جو صد فی صد نہ سہی پچاس فیصد سچ ضرور تھا۔

''مجھے تمہارے نظریہ سے اختلاف تو نہیں مگر اللہ کا یہ احسان ہے کہ اپنی پچاس سالہ زندگی میں مجھے ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا۔''

اماں نے اپنے فطری بھولپن سے کہا، مگر عائشہ آپا بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔انھوں نے اپنی لے میں کہا۔

''آپ لوگوں کے آس پاس ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو نقلی چہرہ لگا کر آپ لوگوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔بس آپ کی سادہ لوحی نے انھیں بے نقاب ہونے سے بچا لیا ہے۔

عائشہ آپا نے بڑی گہری بات کی، پتہ نہیں ان کا اشارہ کس کی طرف تھا؟ عصر کی اذان کیساتھ ہی ہماری محفل برخاست ہوگئی۔ عائشہ آپا بھی اجازت لے کر اٹھ گئیں۔ ابھی ہم لوگ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے کہ ملیحہ حسب معمول مسکراتی ہوئی آ گئی میں نے خالی پیالی میں چائے بنا کر ملیحہ کے ہاتھوں میں تھمادی۔ اس نے میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پیالی تھام لی۔ اماں کو اس کی یہی سادگی بہت پسند تھی۔ تبھی ملیحہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''فرزین آج تمہارے گھر خلاف معمول سناٹا ہے۔ کیا نوکروں نے چھٹی لے لی''

میرے جواب دینے سے پہلے اماں بول پڑیں۔

تم جانتی ہو نوکروں کو کوئی بہانہ چاہیے۔ سکینہ بوا (جو کھانا بنانے پر مامور ہیں) کے گھر میلاد ہے رحیمن بوا تو دس دن سے چھٹی پر ہیں۔ صرف ایک اوپر کے کام والا ملازم لڑکا بچا ہوا ہے۔ وہ بھی شاید کسی کام سے بازار گیا ہوا ہے۔''

اماں نے تفصیل بتائی جب کہ میرا ارادہ ملیحہ کو کچھ بھی بتانے کا نہیں تھا پتہ نہیں کیوں مجھے ملیحہ کا ٹوہ لینے والا انداز پسند نہیں آیا۔ ملیحہ سے ویسے تو میری خوب بنتی ہے۔ اس کا کبھی کبھی لمبے عرصے تک نہ آنا مجھے کھٹکتا ہے مگر کبھی کبھار اس کی کریدتی ہوئی نگاہیں اور نجی باتوں میں دخل اندازی مجھے گراں گذرتی ہے۔ حالانکہ وہ اتنی ہمدردی سے میری دلجوئی کرتی ہے۔ مگر اس کا یہ انداز مجھے قطعی پسند نہیں۔ وہ اس حد تک مجھے پسند ہے کہ عام موضوع پر باتیں کرے۔ دینی اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر باتیں کرتی رہے اور میں سنتی رہوں کیونکہ جب وہ ان موضوعات پر بولنے لگتی ہے تو

لگتا ہے اس کے منہ سے الفاظ نہیں بیش قیمت موتی گر رہے ہوں۔ جب وہ اس سے ہٹ کر بات کرتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے گھر سدھارے اور میں اس کی ذاتی باتوں میں دخل اندازی سے بچ جاؤں۔ تبھی کار کا ہارن بجا۔ میرے شوہر وغیرہ فیکٹری سے واپس آ گئے تھے۔ ملیحہ اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی!

پھر کافی دن گزر گئے زندگی اپنے انداز سے گزرتی رہی۔ ہمارا روٹین وہی رہا یعنی منظر وہی رہتا اور کردار بدلتے رہتے۔ کبھی ہماری محفلوں کی رونق عائشہ آپا سے ہوتی کبھی ملیحہ سے ہوتی۔ اس بار بھی میں اور اماں ہال کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ صبح سے سورج سوا نیزے پر تھا۔ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے موسم ابر آلود ہو گیا ٹھنڈی ہواؤں کے خوشگوار جھونکے کھڑکی کے پردوں سے اٹھکیلیاں کرنے لگے۔ موسم کی تبدیلی نے ہم پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اماں نے ماما کو کافی کے ساتھ گرم گرم پکوڑے اور چٹنی بنانے کی ہدایت کی، تبھی کال بیل کی آواز گونجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ملیحہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے جواب دے کر اسے ہال کمرے کی طرف لے کر آ گئی۔ اماں حسب معمول اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ اس دوران ملازمہ چائے رکھ گئی تھی۔ چائے سے فارغ ہو کر ہم لوگ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ اماں ہم لوگوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر تلاوت قرآن کیلئے اٹھ گئیں۔ صوفیہ اور رابعہ میری دونوں نندیں سسرال میں تھیں۔ وہ دونوں دو دو تین تین مہینے کے وقفہ سے میکے آتی تھیں۔ گڈو اپنی ننھیال گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف اماں اور میں رہ گئے تھے۔ شاید ملیحہ کے لئے اس سے بہترین موقع نہیں ہو سکتا تھا وہ

کھسک کر میرے قریب آ گئی اور رازداری سے پوچھا۔

''فرزین! سنا ہے کہ تمہارے میکہ میں جائیداد کی تقسیم شرعی طریقے سے نہیں کی گئی۔

میں اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ ویسے بھی کسی کا ہماری ذاتیات میں دخل دینا مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا چاہے وہ ہمارا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

''تم نے غلط سنا ہے ملیحہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ہمارے درمیان''

میں نے ناگواری سے ملیحہ کی مداخلت کا دروازہ بند کرنا چاہا۔

''اگر اس تقسیم سے تم مطمئن ہو تو بڑی خوشی کی بات ہے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ تمہارے میکہ والوں نے جائیداد کا بہترین حصہ اپنے تصرف میں رکھ لیا ہے اور کم ترین حصہ بیٹیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔''

ملیحہ نے رازداری کے پردے میں تفصیل جاننا چاہی؟ یہ تو نیا ہی شوشہ چھوڑا تھا ملیحہ نے، تھوڑی دیر کیلئے مجھے ملیحہ سے گھن سی آنے لگی۔ تبھی شاید اس نے میرے چہرے کے تاثرات بھانپ لئے اور ہمدردی سے بھرپور لہجہ میں گویا ہوئی اور قرآن کا حوالہ دیا۔

''تم ایک دوسرے کا مال حرام طریقے سے نہ کھاؤ۔ آپس میں
رضامندی سے تجارت کرو۔ ناجائز طریقے استعمال میں لاکر
اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بے شک اللہ تعالیٰ مہربان ہے''۔

''قرآن کی روشنی چونکہ ہمارے پاس موجود ہے اس لئے راستہ بھٹک جانے

والوں کو صحیح راستہ دکھانا ہمارا فرض ہے۔کیا تمہارے میکہ والے میرے رشتہ دار نہیں۔ان کی غلطیوں کی نشاندھی کرنا کیا میرا فرض نہیں بنتا۔''

ملیحہ نے مجھے قرآن کے حوالے سے قائل کرنا چاہا۔جب کہ ایسا کوئی واقعہ ہمارے ساتھ نہیں ہوا تھا۔اسے شاید کہیں سے سن گن ملی تھی کہ ابا محترم کی وفات کے بعد ہمارے گھر میں اس قسم کا کوئی سلسلہ چل رہا ہے حالانکہ سب کو اس بات کا پتہ تھا کہ ابا مرحوم نے کچھ ایسا حسن انتظام کیا تھا کہ ان کے بعد کسی بھی قسم کا تنازعہ جائیداد کو لے کر نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی ہم لوگ اتنے گرے پڑے ہیں۔پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے والے شاید منتظر تھے کہ بات ہونٹوں سے نکل کر کوٹھوں تک پہنچے۔

''ملیحہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارا خاندان سختی سے شریعت کے قوانین پر عمل کرنے والا ہے۔کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ لوگ حقیری دنیا کے لئے اپنی بیش قیمت آخرت تباہ کرلیں گے''۔

شدید غصہ کو قابو میں کرتے کرتے میری آواز میں تھوڑی سی سختی شامل ہوگئی تھی جسے شاید ملیحہ نے محسوس کرلیا۔

''مجھے معاف کردو فرزین۔شاید میں نے تمھیں ناراض کردیا۔ملیحہ نے ہلکی سی ندامت کے ساتھ کہا۔

''ارے نہیں بہن میں کہاں ناراض ہوں۔بس مجھے اس قسم کی بے سروپا بکواس اچھی نہیں لگتی۔

فرزین نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تمہاری سادہ لوحی ہے ورنہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

ملیحہ اپنی بات پر اب بھی اڑی رہی۔فرزین نے ملیحہ کی باتوں کو سراسر غلط قرار دیتے ہوئے حتمی لہجہ میں کہا۔

''دنیا چاہے کچھ بھی کہتی رہے، ہمارے بیچ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے اور براہ کرم اس ٹاپک کو چھوڑ دو۔آؤ کسی اور موضوع پر باتیں کرتے ہیں۔فرزین نے زچ ہو کر کہا۔

تبھی قریبی مسجد سے اذان کی آواز گونجی ملیحہ خدا حافظ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔اس طرح کافی دن بیت گئے مگر ملیحہ خلاف معمول ہمارے گھر نہیں آئی۔مجھے تشویش ہوئی کہ شاید اس دن کی تلخ کلامی سے متاثر ہو کر وہ ہمارے گھر نہیں آتی۔میرے فون پر بلانے کے باوجود اس نے مصروفیت کا بہانہ بنا لیا۔میں نے بھی چپ سادھ لی۔میں اپنی جگہ مطمئن تھی کہ میں نے اس کی غلط باتوں کا بالکل صحیح جواب دیا تھا۔ اسی طرح اپنی روٹین پر عائشہ آپا تشریف لائیں اور باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور تان ٹوٹی ملیحہ پر باتوں کے دوران عائشہ آپا نے کہا کہ ملیحہ کی سسرال میں جائیداد کا جھگڑا چل رہا ہے۔ملیحہ کی نندوں نے اپنے بھائی ملیحہ کے شوہر پر مقدمہ دائر کر دیا ہے۔چونکہ عائشہ آپا کے شوہر وکیل ہیں وہ ایک اچھے وکیل اور ان کے پڑوسی ہونے کے ناطے یہ کیس انھیں کو ملا ہے۔عائشہ آپا کے انکشاف نے اماں کو پریشان کر دیا۔

''ارے گھر کی بات گھر میں نپٹ جاتی کیوں کورٹ تک جانے دیا ان لوگوں نے''

اماں کے سوال کا جواب عائشہ آپا نے مجھے مخاطب کر کے دیا۔

”دلہن برا نہ مانو تو سارے فساد کی جڑ تمہاری بہن ملیحہ ہی ہے۔“

عائشہ آپا نے مجھ سے معذرت کی اور اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ملیحہ کے سسر نے اپنی زندگی میں اپنی تینوں لڑکیوں اور ایک لڑکے (ملیحہ کے شوہر) کے درمیان جائیداد کی تقسیم کر دی تھی۔ ایک غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انھوں نے صرف زبانی طور پر کہہ دیا تھا کہ کون کتنے کا حقدار ہے۔ ان کی وفات کے بعد بہنوں نے اپنے حصہ کی جائیداد کا مطالبہ کیا۔ تحریری طور پر دستاویز نہ ہونیکی وجہ سے ملیحہ کے شوہر نے اپنی بہنوں کا حق مار لیا۔ معاملہ عدالت میں ہے دیکھیں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔“

عائشہ آپا نے اپنی باتوں کا ردعمل اماں کے چہرے پر دیکھا۔ اماں دم بخود تھیں کہ انھیں ملیحہ سے ایسی امید نہیں تھی۔

”حقوق العباد پر لیکچر دینے والی مساوات کی حامی احادیث کے ذریعہ دلائل دینے والی نے کیا اپنے گھر کے معاملے میں آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔ اس غلط فعل پر کیا وہ اپنے شوہر کو ٹوک نہیں سکتی تھی۔“

اماں نے بے یقینی سے کہا۔

”ارے آپا آپ کیا جانو سارا کیا دھرا ملیحہ کا ہی ہے۔ فرزین کے ساتھ مقابلہ آرائی نے اسے لالچ میں مبتلا کر دیا۔ اس نے شوہر کو ترغیب دلائی کہ بہنوں کی شادی بیاہ میں پہلے ہی بہت روپیہ اٹھ چکا ہے۔ اب تقسیم اس طریقے پر نہیں ہونی چاہیئے جیسے مرحوم نے وصیت کی تھی۔ اپنے طور پر کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کرا دو۔“

”واہ کیا زمانہ آ گیا ہے بیوی نے کہا اور شوہر نے مان لیا۔ بہنوں سے محبت نہ

سہی کیا اللہ اور رسول کا خوف بھی نہیں ؟''

سیدھی سادی اماں جرح پر جرح کیے جا رہی تھیں۔

عائشہ تم پتہ نہیں کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو مجھے ذرا یقین نہیں آتا کہ ملیحہ جیسی بلند کردار بچی اس قدر گناہ کی مرتکب ہو رہی ہے۔

اماں شدید رنج اور بے یقینی میں مبتلا تھیں۔ میں نے اماں کو مخاطب کر کے کہا۔

''اماں! شاید آپ یقین نہ کریں مگر چند دنوں سے مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ ملیحہ جیسی بظاہر نظر آنے کی کوشش کرتی ہے بباطن ویسی نہیں ہے۔ چند دن پہلے کا واقعہ شاید آپ کو یاد ہو جب ملیحہ نے نوکروں سے متعلق پوچھ گچھ کی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس وقت اس کا ٹوہ لینے والا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ ملیحہ کو مجھے تکلیف میں دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ اسے میری خوشگوار زندگی سے جلن محسوس ہوتی تھی۔ اس نے رحیمن بوا کو مجھ سے بدظن کروا کر اپنے گھر نوکر رکھ لیا تھا۔

''دلہن تم نے دیر سے ہی سہی مگر ملیحہ کو درست پہچانا''

عائشہ آپا نے فرزین کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا،

''ملیحہ کے گھر کا ماحول جیسا وہ ظاہر کرتی ہے ویسا ہرگز نہیں ہے۔ اس کے سسرال والے اور شوہر کسی بھی معاملے میں اس کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔ نتیجہ میں گھر کا ماحول ہر وقت کشیدہ رہتا ہے۔ ملیحہ گھر سے فرار حاصل کر کے سکون کی تلاش میں تمہارے گھر چلی آتی ہے۔ صرف یہ دیکھنے کیلئے کہ کہیں تمہارے گھر میں بھی کبھی اس قسم کا ماحول نظر آ جائے۔ تمہاری بے سکونی دیکھ کر اسے تھوڑا سا ہی سہی سکون میسر

آ جائے۔ مگر بد قسمتی سے اسے کبھی کامیابی نہیں ملی۔ الٹا تمہاری خوشگوار زندگی سے وہ پریشان ہو کر تمہیں الٹے سیدھے مشورے دے کر ورغلانے کی کوشش کرتی تھی۔

عائشہ آپا اپنے وکیل شوہر کی معیت میں رہ کر اچھے خاصے دلائل دینے لگی تھیں جو صدفی صد حقیقت پر مبنی تھے۔ اماں دل ہی دل میں ملیحہ کی فطرت سے واقف ہو چکی تھیں۔ انھیں بے ساختہ حضرت عمر کا قول یاد آ گیا۔

ہر انسان بند کتاب کی طرح ہوتا ہے جس کا سرورق کچھ اور، اور اس کے اندرونی صفحات پر کچھ اور ہوتا ہے۔

سوالات:

I ذیل کے سوالوں کے جوابات لکھیے:

1) ملیحہ کیسی لڑکی تھی؟

2) ملیحہ کی خوش مزاجی کو دیکھ کر فرزین کیا سوچتی تھی؟

3) ملیحہ کی آمد پر فرزین کے سسرال والوں پر کیا اثر ہوا؟

4) عائشہ آپا کون تھیں؟ ان کی فرزین کی ساس سے کیسی گفتگو ہوتی تھی؟

5) اچھے لوگوں کے بارے میں فرزین کی ساس کا کیا خیال تھا؟

6) عائشہ پر اس جواب کا کیا اثر ہوا؟

7) فرزین کے میکہ کی جائیداد کی تقسیم کے بارے میں ملیحہ نے اس سے کیا پوچھا؟ اس نے کیا جواب دیا؟

8) فرزین کے میکہ والوں میں جائیداد کی تقسیم کا کیا واقعی کوئی مسئلہ کھڑا ہوا تھا؟

9) ملیحہ کی سسرال میں جائیداد کی تقسیم پر ملیحہ نے کیا رول ادا کیا؟

10) ملیحہ کی فطرت کے تعلق سے فرزین کی ساس کو حضرت عمرؓ کا کونسا قول یاد آرہا تھا؟

II تفصیلی جواب لکھیے۔

1) ملیحہ کے کردار کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2) ملیحہ اور عائشہ آپا کے کردار کا موازنہ کیجیے۔

3) ملیحہ کی ساس کی سادگی اور حق پسندی پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

اختر کی پنسل

عطا عابدی

اختر گیارویں درجے میں پڑھتا تھا۔ سلیم اس کا ہم جماعت تھا۔ اور اس کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے۔ اسکول میں حساب کی گھنٹی میں اختر اپنے بستے سے پنسل نکالنے لگا۔ لیکن اُسے سخت حیرانی ہوئی کہ وہاں پنسل تھی ہی نہیں۔ اختر پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا، آخر اُس کے بستے سے کس نے پنسل نکالی؟ اس نے مجبوراً پنسل کا کام قلم سے کیا، حالانکہ اس کے لیے استاد کی سرزنش بھی سہنی پڑی۔

حساب کے کلاس کے بعد وقفے کی گھنٹی بجی۔ اس نے آس پاس دیکھا تو بغل میں بیٹھا ہوا سلیم موجود نہیں تھا۔ غالباً وہ حساب کے استاد کے نکلتے ہی باہر نکل گیا تھا۔ یہ دیکھ کر اختر کو یہ سوچتے دیر نہ لگی کہ اس کے بستے سے اُسی نے پنسل نکالی ہوگی اور اب اسے چھپانے کے لئے فوراً باہر نکل گیا ہے۔ اُسے حیرت تھی کہ سلیم سے کسی کو اس طرح کی شکایت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ سلیم نے اسی لیے یہ حرکت کی ہوگی کہ اُس پر کسی کو شک نہ ہوگا۔

اسی اُدھیڑ بن میں اختر باہر نکلا۔ کھیل کے میدان میں کئی لڑکے کھیل رہے

تھے۔ درختوں کے نیچے کچھ لڑکے چاٹ اور کچھ مونگ پھلی لے کر کھا رہے تھے۔ ایک دوسری جگہ آئس کریم والوں کے ارد گرد کچھ بچے جمع تھے تو کچھ اپنی اپنی ٹولیوں میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اختر کی نگاہ سبھی جگہ سلیم کو ڈھونڈ رہی تھی لیکن سلیم کا کہیں پتا نہ تھا۔ اختر کو یقین ہو گیا کہ اس کی پنسل سلیم نے ہی چرا لی ہے ورنہ ہر دن اس کے ساتھ کھیلنے والے سلیم کو آج کیا ہو گیا۔

وقفہ ختم ہوا۔ سبھی لڑکے اپنے اپنے درجے میں پہنچے۔ اختر کی نگاہ اب بھی سلیم کو ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن سلیم اپنے درجے میں اُس وقت پہنچا جب استاد بھی آ گئے۔

اختر نے سلیم پر اچٹتی نظر ڈالی۔ اس کی پریشان صورت دیکھ کر اختر کا شک مزید پختہ ہو گیا۔ اختر کا دل اب پڑھائی میں نہیں لگ رہا تھا۔ اُسے بس یہ فکر ستا رہی تھی کہ چھٹی کے بعد سلیم کو وہ کس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے گا۔

چھٹی ہوئی تو سبھی لڑکے خوشی میں جھومتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوئے۔ اختر نے دیکھا سلیم ان میں نہیں تھا۔ اسکول سے باہر نکل کر آگے نظر ڈالی تو سلیم تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ اب اس کو پکا یقین ہو گیا کہ پنسل سلیم نے ہی لی ہے ورنہ سلیم کبھی اس طرح گھر نہیں جاتا تھا۔ وہ تو اس کے علاوہ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ہی گھر جاتا تھا۔ آج چوری پکڑے جانے کے ڈر سے وہ ساتھیوں کو چھوڑ کر اکیلا گھر بھاگا جا رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ گھر جاتے ہی ابو سے سلیم کے پنسل چرا لینے کی بات کرے گا۔ اور اس کے گھر جا کر سلیم کے بستے

سے وہ اپنی پنسل نکال کر اسے چور ثابت کر دے گا۔ اختر نے اپنے ساتھیوں سے بھی سلیم کی آج کی حرکتوں کا ذکر کیا۔ سب نے سن کر سلیم کو پنسل چور قرار دیا۔

اختر گھر پہنچا تو اس کے ابو دفتر سے نہیں لوٹے تھے۔ اس کی بے چینی امّی سے چھپی نہ رہ سکی۔ امی نے آخر پوچھ ہی لیا ''کیا بات ہے بیٹے؟ آج کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

''ہاں امی! آج سلیم نے میرے بستے سے پنسل چرالی۔ پنسل نہ ہونے کے سبب حساب کے استاد سے ڈانٹ بھی سننی پڑی''۔

ماں کچھ اور پوچھنے ہی والی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ امّی نے دروازہ کھولا۔ اختر کے ابو دفتر سے آگئے تھے۔

اختر نے ابو کے گھر میں قدم رکھتے ہی انھیں پنسل کی چوری کا واقعہ سنایا۔ ابو یہ سن کر اپنے پڑھنے لکھنے کی میز پر گئے اور اختر کی پنسل اختر کے حوالے کر دی۔ انھوں نے بتایا کہ آج صبح ان کو ضرورت پڑی تو وہ اس کے بستے سے پنسل نکال کر کام کرنے لگے تھے پھر وہ پنسل بستے میں رکھنا بھول گئے۔ اختر اپنی پنسل مل جانے کے باعث آج ذہنی تناؤ سے آزاد ہو گیا تھا۔ مگر ایک خلش اب بھی اُس کے دل میں تھی۔ آخر سلیم کی حرکتیں آج ایسی کیوں تھیں، وہ اپنی اس خلش کا اظہار کرتا، اس سے پہلے ہی ابو نے پوچھا...

''آخر تم نے سلیم پر ہی پنسل کی چوری کا الزام کیوں لگایا''

اختر نے اس کے جواب میں وقفے کی گھنٹی سے لے کر چھٹی تک کی سلیم کی کارکردگی بیان کر دی۔ یہ سن کر ابو نے کہا۔ بیٹے! جب کسی سے کسی طرح کی بدگمانی ہو جاتی ہے تو اس کی ہر سرگرمی مشکوک نظر آتی ہے۔ اب بتاؤ کہ پنسل تو سلیم نے چرائی نہیں لیکن بدگمانی ہوتے ہی اس کے تمام افعال مشتبہ ہو گئے اور تم ذہنی طور پر پریشان رہے۔''

''ابو! آخر سلیم نے آج اس طرح ....''

''...... ضرور کچھ بات ہوگی بیٹے۔ اگر تمہارے دل میں بدگمانی نہ آتی تو یقیناً تم کو اس کے عمل سے ہمدردی ہوتی اور تم اس کے گھر جا کر معاملے کا پتا لگاتے۔ لیکن تم نے تو بغیر کسی ثبوت کے اسے پنسل چور مان لیا۔ اب تم سلیم کے گھر جا کر دیکھو یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔''

''ہاں ابو، میں جاتا ہوں''۔

اختر، سلیم کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور وہ دوا لانے گیا ہوا ہے۔ اس نے وہیں بیٹھ کر سلیم کا انتظار کیا۔ سلیم جب آیا تو اسے سلام کیا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ماں کو دوائیں دینے لگا۔ سلیم کا ماں کے سوا گاؤں میں کوئی نہ تھا۔ والد دہلی میں ملازمت کرتے تھے۔ اور خاص خاص مواقع پر ہی گھر آپاتے تھے۔ یعنی ماں کی خدمت سے لے کر سودا سلف تک لانے کا کام اسی کے ذمّے تھا۔ سلیم ماں کو دوائیں دے کر فارغ ہوا تو اختر سے مخاطب ہوا۔ ''کہو! اختر کیسے آنا ہوا؟''

اختر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے کہا۔ ''آج اسکول

میں وقفے کے وقت اور پھر چھٹی کے بعد بھی تم مجھ سے اور دوسرے ساتھیوں سے الگ تھلگ رہے تو سوچا کہ گھر چل کر پوچھوں کیا بات ہے؟''

سلیم نے کہا۔ ''دراصل ماں بیمار تھی، اس لیے آج دیر سے اسکول پہنچا۔ اسکول میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا، اس لیے وقفہ ہوتے ہی ماں کو دیکھنے گھر آ گیا اور پھر اسکول گیا۔ اسی سبب سے وقفے کے بعد کی کلاس میں بھی کچھ دیر سے پہنچا۔ چھٹی ہوتے ہی جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا کہ ماں کے لیے دوائیں بھی لانی تھیں۔''

یہ سن کر اختر آبدیدہ ہوگیا۔ اس نے سلیم سے معافی مانگی اور اپنی بدگمانی کی داستان سنادی، اختر کے رویے سے سلیم بھی پگھل گیا اور بولا۔ ''میرے دوست! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو غالباً اسی طرح سوچتا۔ آئندہ کیلئے ہم لوگوں کو ایک بڑا اسبق ملا ہے کہ بدگمانی میں ساری چیزیں مشکوک ہوجاتی ہیں، ہر عمل ایک سازش محسوس ہوتا ہے۔ ہمیں آپس میں خوش گمان ہونا چاہیے تاکہ شک وشبہ کی جگہ اعتبار واعتماد قائم ہوسکے۔''

سلیم کی باتیں سن کر اختر کو ایسا لگا جیسے سر سے ایک بڑا بوجھ ٹل گیا ہو۔

اختر اب اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ رات کی تاریکی گہری ہوتی جارہی تھی لیکن اس کا دل ودماغ فرحت بخش روشنی میں نہایا ہوا تھا۔

سوالات:

1) اختر کی پنسل کب اور کہاں چوری ہو گئی؟

2) اختر نے پنسل چوری ہونے پر دوست کے متعلق کیوں شک کیا؟

3) سلیم کیوں پریشان تھا؟

4) اختر کی پنسل آخر کہاں سے برآمد ہوئی؟

5) اختر کو اپنی غلطی کا احساس کیسے ہوا؟

6) اس کہانی کے مطالعے سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

حاجی مُراد

(ماخوذ)

گاؤں میں داخل ہوں تو سب سے پہلے حاجی مُراد کا گھر آتا تھا۔ صاف، سُتھرا، پاکیزہ، سیدھا سادہ...... بالکل حاجی مُراد کی طرح۔

گھر کے دروازے پر ایک فانوس لٹکتا تھا۔ یہ فانوس ساری رات جلتا رہتا۔ بچے رات کو اس فانوس کی روشنی میں اکھٹے ہو کر کھیلا کرتے. اندھیری راتوں میں یہ فانوس دور سے بُھولے بھٹکے لوگوں کو راستہ دکھاتا۔ ایک طرح سے یہ فانوس روشنی کا مینار تھا۔ سردیوں کے موسم میں ہر رات حاجی مراد یہ فانوس چھجے کے نیچے لٹکا دیتا۔ بارش اور تیز ہواؤں میں بھی یہ فانوس جلتا رہتا۔

حاجی مُراد کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اُس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس پر وہ اناج اور سبزیاں کاشت کرتا تھا۔ اپنی ضرورت پوری کر کے باقی فصل حاجی مراد گاؤں کے غریبوں میں بانٹ دیتا، گاؤں کے لوگ حاجی مراد کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ جب وہ گاؤں سے گذرتا تو بچے ادب سے راستہ چھوڑ دیتے۔

جب وہ مسجد سے نماز پڑھ کر نکلتا تو گھر تک جاتے ہوئے ہر ایک کو سلام کرتا۔

سلام کرنے میں حاجی مُراد ہمیشہ پہل کرتا۔ اُس کا نُورانی چہرہ دیکھ کر لوگوں کو بڑا سکون ملتا۔ جیسے وہ چہرہ فانوس کا روشن ٹکڑا ہے جو سدا روشنی دیتا ہے۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر حاجی مُراد مہمانوں کی خدمت کرنے کے لئے سب سے آگے ہوتا۔ گاؤں کی بچّیاں اس کے سامنے آتیں تو ادب سے سلام کر کے چادر سر پر ٹھیک کر لیتیں۔ حاجی مُراد ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دیتا۔ گاؤں کے بچّے حاجی مُراد کے گھر پر جمع ہو کر لکھنا پڑھنا سیکھتے۔ لوگوں کے گھریلو جھگڑوں میں حاجی مُراد اُن کی صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا۔ گاؤں میں کوئی بیمار پڑ جاتا تو وہ اسے اپنی چھوٹی سی گدھا گاڑی میں حکیم کے پاس لے جاتا۔

پچھلے سال موسم گرما کی بات ہے۔ گندم کے کھلیان بھرے پڑے تھے کہ کسی وجہ سے ان میں اچانک آگ لگ گئی۔ حاجی مُراد شہر سے واپس آرہا تھا۔ اُس نے دور سے کھیتوں میں آگ اور دُھواں دیکھا تو اپنی گدھا گاڑی کو جلدی جلدی بھگاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ گاؤں کے لوگ پانی کی بالٹیاں اور مٹکے بھر بھر کر آگ بجھا رہے تھے۔ حاجی مراد نے بھی ایک بالٹی اُٹھائی اور تالاب سے پانی بھر بھر کر کھلیانوں پر ڈالنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں آگ پر قابو پا لیا گیا۔ شام کو گاؤں کے لوگ حاجی مُراد کے گھر میں جمع ہوئے۔ جن لوگوں کی فصل جل گئی تھی اُن میں حاجی مُراد نے اپنے گھر میں پڑی ہوئی گندم بانٹ دی۔ کچھ کسانوں کے مکان بھی جل گئے تھے۔ حاجی

مُراد نے کہا...... یہ گاؤں میری گدھا گاڑی کی طرح ہے جس پر سوار ہم سب ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ تو پھر کیوں نہ ہم مل کر اپنے مصیبت کے مارے بھائیوں کی مدد کریں۔ چلو ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ اور جلے ہوئے مکانوں کی چھتیں پھر سے ڈالتے ہیں گاؤں کے آدھے لوگ جنگل سے لکڑیاں لینے چلے گئے۔ آدھے لوگ گارا تیار کرنے لگے۔ حاجی مُراد نے لکڑیاں لانے اور گارا ڈھونے میں گاؤں والوں کا پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ دو دن میں گاؤں کے جلے ہوئے مکان نئے سرے سے بن گئے۔ اس دن حاجی مُراد نے گاؤں بھر میں تل والا گڑ بانٹا اور نماز کے بعد شکرانے کے نفل ادا کیے۔

ایک دن حاجی مُراد کسی ضروری کام سے اپنی گدھا گاڑی پر بیٹھ کر شہر گیا۔ جاتے ہوئے کہہ گیا کہ شام تک واپس آ جاؤں گا۔ دوپہر کے بعد ایک نوجوان دوڑتا ہوا گاؤں میں آیا۔ اُس نے گاؤں والوں کو بتایا کہ دریا کے پُل پر حاجی مُراد کی گاڑی اُلٹی پڑی ہے اور گدھا غائب ہے۔ لوگوں کے چہرے اُتر گئے۔ کسی نے کہا کہ چل کر دیکھیں تو سہی کہ وہ گدھا گاڑی کس کی ہے؟ گاؤں والے بھاگم بھاگ دریا کے پُل پر پہنچے۔ دیکھا۔ گاڑی سچ مُچ حاجی مُراد کی تھی۔ بانس پر کھجور کی شاخ لگی تھی اور پہیّوں پر تانبے کی میخیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ کہیں حاجی مُراد دریا میں تو نہیں ڈوب گیا تھا؟ کچھ لوگوں نے غم سے سر جھکا لیے۔ عورتوں نے یہ بُری خبر سُنی تو رونے لگیں۔ ایک بزرگ

نے کہا حاجی مُراد نہیں مرا۔ نیک اور خدمت کرنے والے لوگ کبھی ایسے نہیں مرا کرتے۔ کون کہتا ہے کہ حاجی مُراد کو موت آ گئی؟

گاؤں میں کہرام سا مچ گیا۔ عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان سبھی حاجی مراد کا نُورانی چہرہ یاد کر کے اُداس تھے۔ اُس رات گاؤں میں کسی نے کچھ نہ پکایا۔ دن کا بچا کھچا کھا پی کر بستروں پر لیٹ گئے۔ مگر نیند کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ ہر کوئی حاجی مُراد کے گھر کے باہر فانوس رات بھر جلتا رہا۔

فجر کی نماز کے بعد گاؤں کی مسجد میں حاجی مُراد کیلیے دعائیں مانگی گئیں۔ کچھ لوگوں کو ابھی تک یقین تھا کہ حاجی مُراد زندہ ہے، کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ دریا میں حاجی مُراد کی لاش ڈھونڈ کر اسے عزت کے ساتھ دفن کرنا چاہیے۔

اُسی بزرگ نے ایک بار پھر کہا...... حاجی مُراد زندہ ہے کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اُس کے گھر کے آگے ساری رات فانوس جلتا رہا ہے؟

ابھی یہ بات اُس بزرگ کے منہ میں تھی کہ دُور سے حاجی مُراد کی گاڑی کی گھنٹی سنائی دی۔ لوگوں کے دل اُس کی آواز پر زور زور سے دھڑکنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دُور حاجی مُراد کھجوروں کے جھنڈ میں گدھا گاڑی لیے چلا آ رہا ہے۔ اُس کے چاندی جیسے سفید بال صبح کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ انھوں نے دوڑ کر حاجی مُراد کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

حاجی مراد نے کہا۔ ''کل شہر جاتے ہوئے گاڑی کا دُھرا ٹوٹ گیا تھا۔ میں خالی گدھا لے کر شہر کو چل دیا۔ شہر میں میرے ایک عزیز دوست کی بچّی کی شادی تھی۔ وہاں رات رُکنا پڑ گیا۔''

حاجی مراد نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کی آنکھیں ابھی تک آنسوؤں سے بھیگی تھیں۔ اُس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم لوگ رو کیوں رہے تھے؟''

اسی بزرگ نے حاجی مُراد کو بتایا کہ کل گاؤں میں یہ خبر اُڑی تھی کہ تم خدا نخواستہ دریا میں ڈوب گئے ہو۔ مگر میں بار بار کہتا تھا کہ نیک اور خدمت کرنے والے انسان کبھی ایسے نہیں مرا کرتے۔

جب حاجی مُراد نے سُنا کہ اُس کی موت کی جھوٹی خبر سے گاؤں کے لوگوں نے غم سے اپنا بُرا حال کر لیا تھا تو اُس کی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اُس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا:

''آج معلوم ہوا کہ آپ سب کے دلوں میں میرے لئے کتنی محبت ہے۔ اگر میں مر بھی جاتا۔ تو آپ لوگوں کے پاکیزہ دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتا.....

سوالات:

1) حاجی مراد کے فانوس سے لوگوں کو کیا فائدہ پہنچتا تھا؟

2) حاجی مراد کی عمدہ خصلتوں کا ذکر کیجیے؟

3) گاؤں میں آگ لگ جانے پر حاجی مراد نے کس طرح عوام کی مدد کی؟

4) حاجی مراد کی موت کی خبر سے گاؤں کے لوگوں پر کیا اثر ہوا؟

5) حاجی مراد کس طرح لوٹ آیا؟

6) عوام کی محبت سے حاجی مراد کس طرح متاثر ہوا؟

7) اس کہانی کے مطالعہ سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

سابقے اور لاحقے:

سابقہ اور لاحقہ اس جز کو کہتے ہیں جو کسی لفظ کے شروع میں یا آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے۔ جس سے اس لفظ کے معنوں میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ جُز بالعموم ایسے ہوتے ہیں کہ زبان میں مستقل طور پر ان کا استعمال نہیں ہوتا، وہ ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوتے جن میں وہ بطور سابقوں اور لاحقوں کے استعمال کیے گئے ہیں۔ جن الفاظ کے شروع میں سابقے لگائے گئے ہوں ان کے آخر میں کبھی ایک ساتھ لاحقے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ایک لفظ سے متعدد الفاظ پھوٹ نکلتے ہیں۔ مثلاً پرہیز گار سے ، ناپرہیز گار ، ناپرہیز گاری

چند سابقوں کی مثالیں

اَ ۔ (نفی کے لئے) اچل، اٹل، اچھوتا، امٹ، امر

اَن ۔ (نفی کے لئے) ان بن، ان پڑھ، ان دیکھا، ان گنت، ان جان، ان مول

با ۔ (ساتھ) بااثر، باایمان، باتدبیر، باحیا

بَر ۔ (اوپر) برآمدہ ، برعکس، برخلاف، برطرف

بِن ۔ (بغیر) بن دیکھے، بن بادل

بے ۔ (نفی) بےادب، بے دلی، بے رحم، بے ڈھب، بے جوڑ

خود ۔ (اپنا) خودبیں، خودپرست، خودپسند، خودسر، خودغرض، خودمختار

خوش ۔ (اچھا) خوش اسلوب، خوش خط، خوش باش، خوش خیال، خوش ذائقہ

سر ۔ سرچڑھا، سربلند، سرتاپا، سرگرداں

صاحب ۔ صاحب اختیار، صاحب حکومت، صاحب اقبال

غیر ۔ غیرموزوں، غیرآباد، غیرحاضر، غیرذمہ دار

لا ۔ لاپتہ، لاوبال، لاجواب، لاچار، لاحاصل، لاوارث

نا ۔ نااتفاقی، ناامید، ناانصافی، نااہل، نابود، ناپاک، ناتواں، نامبارک

ہم ۔ (ساتھ)۔ ہم آغوش، ہم جماعت، ہم عمر، ہم درد، ہم وطن، ہم نام

لاحقے:

ا ۔ (صفت کی علامت) میلا، بھوکا، جھوٹا، گیروا

آباد۔ (ظرفیت) حیدرآباد، عمرآباد، رحمت آباد

پن ۔ سگھڑپن، احمق پن، نادیدہ پن

ار ۔ (وصفیت) لُہار، سنار، چمار، کمہار، گنوار (گاؤں سے)

آرا۔ جہاں آرا، انجمن آرا، صف آرا، گیتی آرا، مسند آرا

آزار۔ دل آزار، مردم آزار، مسافرآزار

اس ۔ پیاس، مٹھاس، کھٹاس

اک ۔ پوشاک، خوراک، تپاک، تیراک، چالاک

طلب۔ آرام طلب، حق طلب، شہرت طلب

فام ۔ گلفام، سیاہ فام

فہم ۔ خوش فہم، کم فہم، پست فہم، نافہم

گاہ ۔ آرام گاہ، عیدگاہ، نمائش گاہ، قربان گاہ

گر ۔ بازی گر، کاری گر، تونگر، غارت گر

مرکب:

جب دو یا دو سے زیادہ کلمات آپس میں مل کر ترکیب پائیں تو ان کو مرکب کہتے ہیں۔

مرکب کی دو قسمیں (۱) مرکب ناقص (۲) مرکب تام

مرکب ناقص: لفظوں کا ایسا مجموعہ جس سے بولنے والے کی پوری بات سننے والے کی سمجھ میں نہ آئے۔

مرکب ناقص کی چند اہم قسمیں:

1۔ مرکب توصیفی : جیسے لال ٹوپی، گرم دودھ

2۔ مرکب اضافی : جیسے اکبر کا گھوڑا، کتابِ خدا

3۔ مرکب عطفی : رحیم اور کریم

4۔ مرکب عددی : پانچ لڑکے، بارہ برس

5۔ اشارہ : یہ کتاب، وہ ٹوپی

اوپر کی ترکیبیں چونکہ پورے معنے کو ظاہر نہیں کرتیں اس لئے مرکب ناقص کہلاتی ہیں۔

جملے کی تعریف اور اس کی قسمیں:

مرکب تام کو جملہ کہتے ہیں۔

جملہ کی تعریف: لفظوں کا ایسا مجموعہ جس سے بولنے والے کی پوری بات سننے والے کی سمجھ میں آجائے۔ جیسے اکبر گیا، بلی نے چوہے کو پکڑا۔

جملے کے دو حصے ہوتے ہیں۔ (۱) مبتدا (۲) خبر

مبتدا : وہ کلمہ ہے جس کے بارے میں کوئی بات بتائی جائے۔

خبر : مبتدا کے بارے میں جو بات بتائی جائے اسے خبر کہتے ہیں۔ جیسے اوپر کے جملوں میں اکبر اور بلی مبتدا ہیں اور ''گیا'' اور چوہے کو پکڑا خبر ہیں۔

معنے کے لحاظ سے جملہ کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) خبریہ (۲) انشائیہ

(۱) جملہ خبریہ: وہ جملہ ہے جس میں کوئی خبر پائی جائے اور جس کے کہنے والے کو سچا یا جھوٹا کہہ سکیں، جیسے، اکبر گیا، موہن نیک لڑکا ہے

(۲) جملہ انشائیہ: وہ جملہ ہے جس میں کوئی خبر نہ ہو اور جس کے کہنے والے کو سچا یا جھوٹا نہ کہہ سکیں جیسے......

۱) مدراس کہاں ہے۔ ۲) ایک گلاس پانی لاؤ۔

جملہ انشائیہ کی پہچان:

جملہ انشائیہ حسب ذیل صورتوں میں آتا ہے۔

امر : حکم دینا - باہر جاؤ، تم ایک کتاب لاؤ

نہی	:	منع کرنا	- باہر مت جاؤ، ادھر نہ دیکھو
ندا	:	پکارنا	- اے لڑکے، او کھلونے والے
تعجب	:	ایں!	- یہ کون شخص ہے!
ندبہ	:	افسوس کرنا	- افسوس کہ میں غفلت کا شکار ہو گیا
قسم	:	خدا کی قسم	- میں جھوٹ نہیں بولوں گا
تحسین	:	تعریف کرنا	- شاباش تم نے اچھا کام کیا
تنبیہ	:	خبردار کرنا	- خبردار آئندہ چوری نہ کرنا
تمنا	:	خوش کرنا	- کاش میں حج کو جاتا
شرط	:	جو محنت کرتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے	
استفہام	:	سوال کرنا	- تمہارا نام کیا ہے؟
عرض	:	گزارش کرنا	- تم بھی چلو تو اچھا ہے

سوالیہ جملوں کو بیانیہ جملے بنانے کا طریقہ:

سوالیہ جملے تین طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ استفہام استخباری　　۲۔ استفہام اقراری　　۳۔ استفہام انکاری

۱۔ استفہام استخباری: وہ سوالیہ جملہ ہے جس سے صرف کسی چیز کے بارے میں سوال کرنا مقصود ہو۔ جیسے کیا مدراس خوبصورت شہر ہے؟ ایسے جملے کو بیانیہ جملہ میں بدلنے کیلئے صرف اس کا جواب دے دینا کافی ہے۔ جیسے

مدراس خوبصورت شہر ہے۔

۲۔ استفہام اقراری: وہ سوالیہ جملہ ہے جس سے کسی بات کا اثبات اور اقرار سوالیہ انداز میں کیا جائے۔ جیسے کون نہیں جانتا کہ میرا نام احمد علی ہے؟ کیا تم نے مٹھائی چرائی نہیں تھی؟ ان سوالیہ جملوں کے بیانیہ جملے اس طرح بنیں گے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ میرا نام احمد علی ہے۔ تم نے مٹھائی ضرور چرائی تھی

۳۔ استفہام انکاری: وہ سوالیہ جملہ ہے جس میں کسی بات کا انکار سوال کے پیرائے میں کیا جائے جیسے کیا میں چور ہوں؟ لکھی ہے کیا حیاتِ ابد اُن کے واسطے؟ ایسے سوالیہ جملوں کے بیانیہ جملے اس طرح بنیں گے۔ میں چور نہیں ہوں۔

ان کے واسطے حیاتِ ابد نہیں لکھی ہے۔

مثبت اور منفی جملے

جملے کی دو صورتیں ہوتی ہیں ۱۔ مثبت ۲۔ منفی

مثبت جملہ: وہ جملہ ہے جس سے کسی بات کا اثبات یعنی واقع ہونا سمجھ میں آئے۔

جیسے موہن بیمار ہے ، گاڑی آ گئی۔

منفی جملہ: جس جملہ سے کسی بات کی نفی یعنی نہ ہونا سمجھ میں آئے۔

جیسے موہن بیمار نہیں ہے، گاڑی نہیں آئی

مبتدا اور خبر میں مطابقت

مبتدا اگر واحد ہو تو خبر بھی واحد آئے گی۔ جیسے موہن آیا، بیل بھاگا

مبتدا اگر جمع ہو تو خبر بھی جمع آئے گی۔ جیسے لڑکے بیمار ہیں، پھل پک گئے

مبتدا اگر مذکر ہو تو خبر بھی مذکر ہوگی۔ جیسے لڑکا آیا، بیل بھاگا

مبتدا اگر مونث ہو تو خبر بھی مونث ہوگی۔ جیسے لڑکی بیمار ہوگئی، گائے بھاگی۔

اگر مبتدا میں دو یا دو سے زیادہ اسم یا ضمیریں ہوں تو خبر اپنے سب سے قریب کے اسم کے مطابق ہوگی جیسے میرے پاس پانچ کتابیں چار کاپیاں اور ایک قلم ہے

مبتدا اگر اسم جمع ہو تو خبر واحد ہوگی جیسے فوج آگئی جماعت اچھی ہے۔

کلام بلاواسطہ اور کلام بالواسطہ:

کبھی کسی دوسرے شخص کی کہی ہوئی بات اپنی طرف سے ادا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ بلاواسطہ ۲۔ بالواسطہ

۱۔ **کلام بلاواسطہ:** اگر دوسرے شخص کی بات ہو بہو نقل کردی جائے تو اسے کلام بلاواسطہ کہیں گے جیسے......

اکبر نے کہا۔ ''آج ضرور بارش ہوگی''

حامد نے کہا۔ ''میں ضرور پاس ہو جاؤں گا۔''

دوسرے شخص کی کہی ہوئی بات لکھتے وقت واوین کے اندر لکھی جائے گی۔ اور اس کے ساتھ کاف بیانیہ نہیں آئے گا۔

۲۔ **کلام بالواسطہ:** اگر کسی دوسرے کی کہی ہوئی بات ہو بہو ادا کرنے کی بجائے اپنی طرف سے اپنے الفاظ میں ادا کی جائے تو اسے کلام بالواسطہ کہتے ہیں جیسے

اکبر نے کہا کہ، آج بارش ہوگی۔

حامد نے کہا کہ وہ ضرور پاس ہو جائے گا۔

کلام بالواسطہ میں ''کہ'' بیانیہ استعمال کیا جاتا ہے۔ واوین کا استعمال نہیں ہوتا۔ البتہ سکتہ استعمال کرتے ہیں۔ ضمیر متکلم اور فعل متکلم دونوں ضمیر غائب اور فعل غائب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مرکب جملوں کی قسمیں:

ا۔ **جملۂ شرطیہ:** وہ جملہ ہے جو شرط اور جواب شرط سے مل کر بنا ہو۔ اس کے چار جز ہوتے ہیں۔ جیسے......

اگر	آدمی محنت کرتا ہے	تو	کامیاب ہوتا ہے
حرف شرط	شرط	حرف جزا	جزا

۲۔ جملۂ معلّلہ: جس میں ایک جملے کا سبب یعنی علت دوسرے جملے میں بیان کی جاتی ہے۔اس کے تین جُز ہوتے ہیں۔ جیسے......

اکبر مدرسہ کو نہیں آیا	کیوں کہ	وہ بیمار ہے
معلول	حرف علت	علت

۳۔ جملہ استدراکیہ: وہ جملہ جس کے پہلے جملہ میں کوئی شک پایا جائے تو حرف استدراک لاکر اس شک کو دوسرے جملے کے ذریعے دور کر دیتے ہیں۔س کے تین حصّے ہوتے ہیں۔

اکبر ضرور کامیاب ہوتا	لیکن	وہ بیمار ہو گیا تھا
مستدرک منہ	حرف استدراک	مستدرک

۴۔ جملۂ ندائیہ: جس میں ندا پائی جائے، اس کے تین حصّے ہیں، جیسے

اے	کھلونے والے	ادھر آ
حرف ندا	مناویٰ	جوابِ ندا

۵۔ جملۂ قسمیہ: جس میں قسم پائی جائے، اس کے تین حصے ہوتے ہیں۔

قسم	خدا کی	میں نے چوری نہیں کی
حرفِ قسم	قسم	جوابِ قسم

۶۔ **جملۂ معطوفہ:** ایسے دو جملے جو حرف عطف کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہوں، اس کے تین حصے ہیں۔ جیسے......

گھنٹی بجی	اور	گاڑی چلی
معطوف علیہ	حرفِ عطف	معطوف

۷۔ **جملۂ موصولہ:** جو موصول اور صلہ سے مل کر بنا ہو۔ اس کے تین حصے ہیں۔ جیسے

جو	شخص محنت کرتا ہے	کامیاب ہوتا ہے
ضمیر موصولہ	موصول	صلہ

نحوی ترکیب: کسی مرکب کے تمام الفاظ میں آپس کے لگاؤ یا تعلق کو ظاہر کرنے کو ترکیب نحوی کہتے ہیں۔

مفرد جملے کی نحوی ترکیب اس طرح ہوگی

۱۔ جمیل بیمار ہے

جمیل - مبتدا جملہ مفرد خبریہ

بیمار ہے - خبر (اسمیہ)

۲۔ اکبر نے شیر مارا

اکبر - فاعل		
شیر - مفعول		جملہ مفرد خبریہ
مارا - فعل		(فعلیہ)

توسیع: عام طور پر مبتدا اور خبر مفرد ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مبتدا یا خبر کی وضاحت کرنی پڑتی ہے تا کہ بات پوری طرح سمجھ میں آ سکے۔ جیسے آٹھویں جماعت کے تمام لڑکے اول درجے میں کامیاب ہوئے۔

لڑکے	: مبتدا	
آٹھویں جماعت کے	: توسیع مبتدا	مبتدا
کامیاب ہوئے	: خبر	جملۂ مفرد خبریہ
اول درجہ میں	: توسیع خبر	خبر